ٹیپو سلطانؒ

مرتبہ

عبد اللہ بٹ، بی۔ اے (آنرز)

پبلشرز
قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور

اشاعت چہارم

سنہ ۱۹۶۳ء

شیخ محمد نصیر ہمایوں، پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس، بُل روڈ لاہور میں
چھپوا کر قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ لاہور سے شائع کی

فہرست مضامین

پیش لفظ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اُس وقت طبع ہُوا تھا جب انگریزوں کی غلامی سے مُلک کو آزاد کرانے کی لڑائی زوروں پر تھی اور غیر مُلکی حاکموں نے ایسے لوگوں کی زندگیوں کے حالات کی نشر و اشاعت پر کڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں جنھوں نے آزادیٔ وطن کے لئے قُربانیاں دی تھیں اور مُلک کے عوام اُنکے حالات سے جرأت حاصل کر سکتے تھے۔

پنجاب کے مُسلمان طالب علموں کی جماعت مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے وقت کی اہم ضرورت کا احساس کرتے ہُوئے شہیدِ حُریّت سلطان ٹیپُو رح کا دِن منانے کی تیاریاں کیں اور مُلک کے مشہور اہلِ قلم کو سلطان شہیدؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالے لکھنے کی دعوت دی۔

طلباء کی اس جماعت کی کوششوں سے یہ تحریک نہایت کامیاب رہی اور مشہور مقررین اور دردِ دل رکھنے والے مصنّفین نے "ٹیپُو ڈے" کے اجتماع

میں شرکت کر کے آزادئ وطن کے اُس علمبردار کی رُوحِ پُر فتوح کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اجتماع کے خاتمے پر ہم نے محسوس کیا کہ اگر ان تمام مقالوں۔ تقریروں اور نظموں کو ایک کتاب کی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے تو سلطان ٹیپو رح کی زندگی اور مشن کے بارے میں ایک قابلِ قدر مجموعہ بن جائے گا۔ مَیں اُن دِنوں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا پبلسٹی سیکرٹری تھا۔ اِس لئے کتاب کی تدوین کا کام میرے سپرد کیا گیا

آزادی کی جنگ میں حصّہ لینے کے لئے عوام کے دِلوں میں جذبہ پیدا کرنا اِس کتاب کی اشاعت کا مقصد تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سوچ کر مَیں نے کتاب کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا۔ کہ سلطان شہید کی شاندار زندگی کے حالات کو دُہرانے اور عوام کو انکے مشن سے رُوشناس کرنے کی ضرورت اس وقت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ایک تو اس لئے کہ آزادی کی حفاظت آزادی کے حصُول سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ بہادر مسلمانوں کی زندگی کے حالات عام کر کے حال کے نوجوانوں کے دِلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کی جائے انھیں یاد دلایا جائے کہ وُہ کن بزرگوں کی اولاد ہیں اور تاریخ کے صفحات میں ان کے بزُرگوں نے کیسے شاندار کارنامے ثبت کئے ہیں۔ دُوسرے اس لئے کہ ہم پاکستانی بھی اسی بلند نصبُ العین کو سامنے رکھ کر جدّ وجہد کے میدان میں نکلے ہیں۔ جس کا آغاز سلطان شہید رح نے کیا تھا۔ ایک جامع

اسلامی نظامِ حکومت کا قیام اور تمام دُنیا کے مُسلمانوں کی خوشحالی۔ عزّت۔ آزادی اور یگانگت ہمارا نصبُ العین ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ سُلطان شہیدؒ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بھی یہی تھا۔

مجھے اُمید ہے قارئین کرام اِس کتاب کا مطالعہ اسی نُقطۂ نظر سے کریں گے۔

عبداللہ بٹ

دیباچہ

سُلطان فتح علی معروف بہ ٹیپوؒ کی زندگی پر مقالات اور خُطبات کا یہ ایک عمدہ مجمُوعہ ہے جس کی تدوین و اشاعت کا شرف آل پنجاب مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو حاصل ہو رہا ہے اور مَیں فیڈریشن کے لائق سیکرٹری جناب عبدُاللہ بٹ صاحب کا شکر گزار ہُوں کہ اُنھوں نے اس مجمُوعے کے متعلق اظہارِ خیال کا مجھے موقع دیا۔

تاریخ در اصل انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کُل نوعِ انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے اور اپنے مستقبل کو آزمودہ بھلائیوں سے دُرست اور آزمودہ بُرائیوں سے محفُوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ اس دفتر میں مختلف نمائندہ شخصیتوں، اداروں، قوموں اور جماعتوں کے کارنامے ایک مربُوط اور مسلسل طرزِ عمل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں،

جنھیں دیکھ کر ہم اُن کی نفسیات، اُن کی افتادِ مزاج اور اُن کی طبیعت کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاکہ آئندہ ان کے ساتھ ہم ایک اجنبی کی طرح نہیں بلکہ ایک واقف کار کی طرح معاملہ کر سکیں۔ یہ دفتر اجتماعی زندگی کے لئے مدارج کے اعتبار سے بہت زیادہ مگر نوعیت کے لحاظ سے وہی اہمیت رکھتا ہے جو فردِ واحد کی زندگی میں اسکے حافظہ کو حاصل ہے۔ اگر ایک فردِ واحد کا حافظہ اس سے سلب کر لیا جائے تو وہ پے در پے غلطیاں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنی غلطیوں کا خود شکار ہو کر رہ جائیگا۔ اگر کسی شخص کی گزشتہ زندگی کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہ ہو تو ہم اسکے متعلق صحیح رائے نہ قائم کر سکیں گے اور نہ اسکے متعلق اپنے طرزِ عمل کا صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔ بالکل یہی صورت جماعتی زندگی کی بھی ہے کہ اگر ہم نوعِ انسانی کے اور خود اپنے اور ان قوموں اور اداروں کے جن سے ہمیں سابقہ پیش آتا ہے، پچھلے ریکارڈ سے واقف نہ ہوں تو ہماری اجتماعی زندگی غلط کاریوں اور غلط اندیشیوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس "دفترِ پارینہ" کے اوراق کو کبھی کبھی نہیں بلکہ بار بار جائزہ لیتے رہیں۔

لیکن تاریخ کے اس دفتر کا جائزہ لینے کے لئے تین نقطۂ نظر ممکن ہیں۔ ایک نقطۂ نظر محض معروضی مطالعے کا ہے، یعنی واقعات اور حالات جیسے کچھ بھی گزرے ہیں، اُن کو جوں کا توں دیکھا جائے۔ دوسرا نقطۂ نظر قوم پرستانہ مطالعے کا ہے، یعنی ہم واقعات کو اُس نسل یا اُس قوم یا اس مُلک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں جس سے ہمارا تعلق ہے، اسی لحاظ سے نتائج اخذ کریں اور اسی لحاظ سے اشخاص اور اقوام کے متعلق رائے قائم کریں۔ تیسرا نقطۂ نظر مقصدی اور اصولی

ہے، یعنی ہم نسلی و قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر مجرد انسانی فلاح و سعادت کو مقصود ٹھیرا کر اور نیک و بد کا ایک بے لاگ معیار سامنے رکھ کر نسل انسانی اور اسکے مختلف اجزاء کے کارناموں کو جانچیں اور بے لاگ ہی رائے قائم کریں۔ ان میں سے پہلا نقطۂ نظر خاص مورخانہ ہے اور اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس طرح کے مطالعے سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں مگر بجائے خود مفید نہیں ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر میں بڑی جاذبیت ہے۔ بلا مبالغہ تاریخ کے ۹۸ فیصدی طالب علموں کو اسی نقطۂ نظر کی جاذبیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کیونکہ ہر طالب علم بہر حال کسی نہ کسی نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتا ہے اور اسکی خود غرضی وسعت اختیار کر کے بآسانی شخصی خود غرضی سے قومی خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسلئے وہ اپنے اور اپنی قوم ہی کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ اس میں اُسے فخر و ناز کے لئے چند بُت مل جاتے ہیں جن کی پرستش کا نشہ اسے اور اسکی قوم کو ابھرنے میں مدد دیتا ہے اور اسی میں اس کو نفرت اور عداوت کے لئے چند ہدف بھی مل جاتے ہیں جن پر اپنے جذبات غضب کو مرکوز کر کے وہ قومی وحدت، مقابلہ و مسابقت اور کامیابی و برتری کے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں اکثر جھوٹ اسی مطالعے کی بدولت پھیلے ہیں۔ اکثر ظلم، اکثر بے انصافیاں، اکثر خونریزیاں اور قومی و نسلی عداوتیں اسی کی بدولت برپا ہوئی ہیں۔ اکثر بروں کو اچھا، اکثر شیطانوں کو مرکز پرستش اسی مطالعے نے بنایا ہے۔ اکثر اچھوں کو برا اور اکثر نیکوکاروں کو لعن طعن کا ہدف اسی مطالعے کی بدولت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانیت کو مجروح

کرنے اور زمین کو فساد سے بھرنے میں تاریخ کے اس طرزِ مطالعہ کا کچھ کم حصّہ نہیں ہے۔ یہ مرض دُنیا میں ترقّی کر کے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب قومی اغراض کے لئے تاریخیں گھڑی جاتی ہیں۔ جن قوموں کا ماضی کچھ نہ تھا وہ ایک پُورا ماضی اپنی خواہشات کے مطابق تصنیف کر کے رکھ دیتی ہیں اور جن سے حال میں مقابلہ درپیش ہے، اُن کے ماضی کی تصویر کو لتارّ سے منقّش کر کے تیار کر لی جاتی ہے تاکہ نئی نسلوں میں ان کے خلاف بُغض پیدا کیا جا سکے۔ رہا تیسری قسم کا مطالعہ تو وہ یقیناً سب سے بہتر ہے۔ مگر اس کے صحیح و نتیجہ خیز ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ بجائے خُود انسانی فلاح و سعادت کا نظریہ دُرست اور نیک و بد کا معیار صحیح ہو۔ دُوسرے یہ کہ واقعات جن پر استدلال کی عمارت اُٹھائی جاتی ہے، معروضی مطالعے کے ذریعے سے اخذ کئے گئے ہوں، نہ کہ اپنے نظریے کو سامنے رکھ کر ان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا گیا ہو۔

اسلام چُونکہ کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مسلک ہے جو مطلقاً انسان اور اُس کی سعادت سے تعلّق رکھتا ہے۔ اور ان تعصّبات سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے جو انسانوں کی نسلی، قومی اور جغرافیائی تقسیمات سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا تاریخ میں اس نے بھی آخری رویّہ اختیار کیا ہے۔ اگر ایک مُسلمان صحیح اسلامی ذہنیت کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ واقعات کو جیسے کہ وہ فی الواقع گزرے ہیں بلا کسی تعصّب کے

جوں کا توں سامنے رکھے اور پھر اسلام نے جو معیارِ حق و باطل اُس کو دیا ہے اس کے مطابق اشخاص، اقوام اور اداروں کے رویّوں کو جانچ کر بے لاگ نتائج اخذ کرے۔ غلطی جہاں بھی ہو، کوتاہی جہاں بھی پائی جائے اُسے بے تکلف وہیں اُنگلی رکھ دینی چاہیے اور کھوج لگانا چاہیئے کہ اس کی پیدائش کے اسباب کیا ہیں اور اس نے انسانی فلاح و سعادت پر کیا اثر ڈالا ہے، کتنا اور کس طرح اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح خوبی جہاں اور جس میں بھی نظر آئے، بلے تکلف اس کا ادراک کرنا چاہیئے اور اسکے مفید نتائج یا غیر نتیجہ خیز رہ جانے کے اسباب کا سراغ لگانا چاہیئے۔ ٹھیک یہی رویّہ ہے جو قرآن میں سوانحِ اشخاص اور تاریخِ اقوام سے بحث و استدلال کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔

تاریخ کے باب میں یہ اسلام کا مسلک ہے، اور مسلمان کا بھی یہی مسلک ہونا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخی اور تہذیبی اسباب نے مُسلمانوں کو ایک خیالی جماعت کے بجائے ایک نسلی و تہذیبی قومیت میں تبدیل کر دیا ہے اور دُنیا کی دُوسری قوموں کا طرزِ عمل دیکھ دیکھ کر ان کے اندر بھی قوم پرستی کا جذبہ اُبھر رہا ہے۔ اس لئے مُسلمان اب عموماً تاریخ میں وُہی قوم پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے جا رہے ہیں، جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا۔ وہ اپنی پچھلی تاریخ کا جائزہ اب اس غرض کے لئے لینے لگے ہیں کہ فخر کرنے کے لئے اُنھیں کچھ ہیرو درکار ہیں، پرستش کرنے کے لئے کچھ بُتوں کی ضرورت ہے۔ مقابلہ و مسابقت اور جدّ و جہد

کے میدان میں پیش قدمی کرنے کے لئے کچھ قومی تفاخر کا نشہ اور کچھ قومی عداوت کا غصّہ مطلوب ہے۔ اسی جنس کے جذبات میں سے ایک جذبہ یہ بھی ہے کہ پچھلے زمانوں کے مسلمان اشخاص یا گروہوں کو بے عیب مجسّمۂ فضائل، مجموعۂ کمالات اور مثالی شخصیتوں کا مالک ثابت کیا جائے خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ اس طرح ان کی حقیقی کوتاہیوں کا پشتارہ اسلام کے سر پہ رکھ کر ہم نادانستگی میں اسلام کی پوزیشن دُنیا کے سامنے غلط طور پہ پیش کرنے کا سبب بن جائیں۔ یہ طرزِ عمل اپنی اصل و بُنیاد کے اعتبار سے بالکل غیر اسلامی ہے۔ اسلام اس جذبے ہی کی قدر کرنے سے انکار کرتا ہے جس کی تحریک پر یہ ساری کاوشیں کی جاتی ہیں مگر قوم پرستی جب "مُسلم قوم پرستی" کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ جب غیر مُسلموں کے بجائے مُسلمانوں کی حمایت اور مسلمانوں کو سراہنے اور ان کا بول بالا کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو عیب، صواب بن جاتا ہے اور گناہ نیکی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس معاملے میں حق کو باطل سے ممتاز کرنا اور اسلام کی بے لاگ راستی پر قائم رہنا بڑی بڑی بلند پایہ رُوحوں کے لئے بھی مشکل ثابت ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ وطنی قوم پرستی کی بُرائی تو تھوڑے استدلال سے ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی ہے مگر "مُسلم قوم پرستی" جو اپنی اصل و رُوح کے اعتبار سے بعینہٖ اُسی نوعیت کی چیز ہے، مشکل ہی سے کسی کو غلط محسُوس ہوتی ہے۔

سلطان ٹیپُو رحؒ کے متعلق ہمیں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ جس ادارے

(یعنی پادشاہی کے ادارے) سے تعلق رکھتا تھا وہ فی الاصل اسلام کے خلاف تھا۔ اس کی حکومت کا دستور اسلامی نہ تھا۔ بادشاہی نظام، جس پر ہندوستان میں ان تمام حکومتوں کی بنا ابتداء سے قائم ہوتی رہی ہے، جنھیں غلطی سے "اسلامی حکومتیں" کہا جاتا ہے، دراصل وہ سب سے بڑا گناہ تھا جس کی وجہ سے اسلام کی حقیقی نعمتوں سے ہندوستان کبھی بہرہ ور نہ ہو سکا۔ اس گناہ میں، جہاں تک کہ اساسِ حکومت کا تعلق ہے ہمارے بہتر سے بہتر حکمران بھی اتنے ہی شریک تھے جتنے بدتر سے بدتر حکمران، سلطان ناصرالدین - غیاث الدین بلبن - محمد تغلق - عالمگیر - ٹیپو سلطان اور اس قسم کے دوسرے افراد نے اپنی ذاتی خوبیوں کے سبب سے جو کچھ اچھے کام کئے، ان کی حیثیت بہرحال انفرادی ہے۔ وہ دستور اور وہ نظام جس سے ان کا تعلق تھا، بجائے خود غلط تھا۔ اس لئے ان معدودے چند افراد کی خوبیوں سے اس غلط نظام کے برے نتائج نہ رک سکے۔ اس بادشاہی کے اثر سے جو غلط سیاسی - اخلاقی - تمدنی اور معاشی نظامِ زندگی یہاں بن گیا تھا، یہ چند اچھے حکمران اس میں کوئی بنیادی اصلاح نہ کر سکتے تھے اور نہ کر سکے۔ اہلِ ہند نے اس سیاست کو اپنی پرانی راج نیتی سے اس معاشرت کو اپنی معاشرت سے اور اس معیشت کو اپنی پرانی معیشت سے کچھ زیادہ بلند اخلاق نہ پایا کہ جو اس کے گرویدہ ہوتے۔ یہاں بھی انسانوں کے درمیان وہی اونچ نیچ تھی، انسان اسی طرح انسان کا خدا بنتا تھا، ویسے ہی معاشرتی امتیازات تھے، ویسا ہی معاشی ظلم تھا جس کے یہ لوگ پہلے سے خوگر تھے۔

اگر فرق تھا تو محض مدارج کا تھا - اصل اور جوہر کا نہ تھا - اس وجہ سے یہاں نہ اتنا مکمل سماجی انقلاب رونما ہو سکا جو شام - عراق اور مصر میں اسلامی فتح سے ہوا تھا اور نہ اسلام اور مسلمان کی وہ عزت کبھی دلوں میں قائم ہو سکی جو اصلی اسلامی حکومت کی بدولت مشرقِ قریب کے ممالک میں قائم ہوئی تھی۔

پس ٹیپو سلطان یا کسی دوسرے مسلمان بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ اصلی مسلمان حکمران کے نمونے نہیں ہیں - اگر ہم اس کو بھول جائیں گے تو جس ادارے سے ان کا تعلق تھا اور جس کی ناگزیر بُرائیوں سے وہ بری الذمہ نہ تھے، وہ خواہ مخواہ اسلام کے سر منڈھا جائے گا - اور یہ چاہے ان اشخاص کے ساتھ محبت کا اقتضاء ہو، مگر اسلام کے ساتھ انصاف نہ ہوگا - البتہ یہ صحیح ہے کہ اس غلط نظام اور اس غیر اسلامی دستور کے اندر رہ کر کام کرنے کے باوجود جو اخلاقی خوبیاں ٹیپو سلطان اور بہت سے دوسرے مسلمان بادشاہوں سے ظاہر ہوئیں، وہ اسلام ہی کے اثرات تھے - اسلام بالواسطہ طریقے سے غیر اسلامی نظام کے اندر نفوذ کر کے جو کچھ اصلاح کر سکتا تھا اس نے کی - اور یہ واقعہ ہے کہ بادشاہی جیسے بد اصل اور ناپاک نظام میں جس بلند کردار کے بادشاہ مسلمان پیش کر سکتے ہیں، شاید کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی - ٹیپو سلطان - عالمگیر - محمد تغلق اور ناصر الدین تو بہت اونچے درجہ کے لوگ ہیں، اوسط درجہ اور بگڑے ہوئے بادشاہوں کی تاریک زندگیوں میں بھی بارہا اسلام کے زبردست اثر کی بدولت خدا ترسی، صداقت پسندی،

حق آگاہی، تواضع و انکسار اور قانون کے احترام کی چمک نمودار ہوگئی ہے۔

شخصی حیثیت سے سلطان ٹیپو ایک بہترین شخص تھا۔ غیر ذمہ دارانہ بادشاہی کے اختیارات رکھنے کے باوجود وہ خدا سے ڈرتا تھا۔ اسلامی قانون کا احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ قانون کی خلاف ورزی سے اس نے اکثر پرہیز کیا۔ اپنے وعدوں کی پابندی کی۔ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آیا۔ رعایا کی دولت کو اپنی عیاشی پر اس نے نہیں لٹایا۔ خلق خدا کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا۔ غیر مسلم جو اس کی حفاظت میں تھے ان سے انتہائی رواداری اور فیاضی کا سلوک کیا ایک مسلمان حکمران کے اصلی فرائض بڑی حد تک بجا لانے کی کوشش کی۔ غیر مہذب لوگوں کو جانوروں سے آدمی بنایا۔ تعلیم پھیلائی۔ بد اخلاقیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ غلط رواجوں (مثلاً کثرتِ ازدواج ۔ بے ستری دیو داسی وغیرہ) کو مٹانے میں اپنا پورا زور صرف کیا۔ لڑائیوں میں اپنے دشمنوں تک سے وہ برتاؤ کیا جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ تاہم جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ اس کی خوبیاں بیان کرتے وقت ہمیں ناظرین کو اس بات پر متنبہ کر دینا چاہیئے کہ یہ پورے اور اصلی مسلمان حکمران کا نمونہ نہیں ہے۔ یہ اصل پیمانے سے بہت کم ہے۔ پوری شان کے مسلمان حکمران کو دیکھنا ہو، تو ابوبکر صدیق رضؓ اور عمر فاروق رضؓ کو دیکھو۔

سیاسی تدبّر اور حسنِ تدبیر کے لحاظ سے بھی ٹیپو سلطان کوئی معمولی شخص

کا انسان نہ تھا۔ ہندوستان میں وہ پہلا شخص تھا جس نے بحری بیڑے کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس غلطی کی تلافی کرنے کی کوشش کی جو اس سے پہلے کے مسلمان حکمران کرتے رہے تھے۔ ہندوستان میں وہ ایک ہی شخص تھا جس نے انگریزی امپیریلزم کے بڑھتے ہوئے اثر کے خطرات پوری طرح محسوس کئے اور ان کو روکنے کے لئے بہترین سیاسی اور حربی تدبیریں جو اس وقت ممکن تھیں، استعمال کیں۔ تمام مشرقی ممالک میں وہ پہلا شخص تھا جس نے جدید فنِ جنگ اور جدید آلاتِ جنگ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور اپنی فوجی طاقت بڑھانے کی تدبیریں کیں۔ اس کے سیاسی تدبر کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ اُس نے ایک طرف صنعت اور تجارت کے ذریعے سے اپنی سلطنت کی معاشی طاقت مضبوط کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف گردونواح کے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ سمٹ کر اس سلطنت میں جمع ہو جائیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مضبوط معیشت اور اُس متحد آبادی کی سیاسی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔ پھر جس طرح اس نے مغربی قوموں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اُٹھانے اور مسلمان ریاستوں کو متحد کر کے بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کیں، وہ اسکی سیاسی دوربینی پر دلالت کرتی ہیں۔

مگر ان تمام قابلیتوں کے باوجود کیوں ناکام رہا؟ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یہ سب خوبیاں اور قابلیتیں محض ایک شخص کی ذاتی تھیں۔

اجتماعی نہ تھیں۔ ہندوستان کے عام باشندے، اور خود مُسلمان قوم کے جمہور اخلاقی حیثیت سے پوری طرح بگڑ چکے تھے۔ ان کے اندر کوئی اجتماعیت نہ تھی۔ کسی مشترک وفاداری کے رشتے میں وہ بندھے ہوئے نہ تھے۔ درحقیقت فرد فرد الگ تھا۔ اور ہر فرد اپنی ذات کے سوا کسی کا وفادار نہ تھا۔ اجتماعی طاقت بہر حال کسی مشترک محبوب کی وفاداری سے بنتی ہے۔ خواہ وہ محبوب خداوند تعالےٰ کی ذات ہو یا قوم، یا مُلک یا کوئی اور چیز۔ لیکن یہاں سرے سے کوئی مشترک تھا ہی نہیں۔ ہر شخص کا محبُوب خود اس کا اپنا وجود تھا۔ دُوسری طرف انگریزی قوم تھی جس میں اخلاقی حیثیت سے کتنے ہی عیوب تھے مگر بہر حال قومیت کے محبُوب کی وفاداری میں وُہ سب ثابت قدم تھے۔ جو انگریز جس پوزیشن میں اور جہاں کام کر رہا تھا خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی قوم کی برتری کے لئے کوشاں تھا اور اس غرض کے لئے جھوٹ، فریب، بے ایمانی، سازش، ایمانوں کی خرید و فروخت اور سرفروشی و جانبازی سب ہی ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ پس در اصل ٹیپو اور انگریزوں کا مقابلہ ایک شخص اور ایک قوم کا مقابلہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے نامساوی مقابلے میں شخصِ واحد کا شکست کھانا امرِ طبعی تھا۔ اگر ٹیپوُ سلطان بادشاہ کے بجائے ایک مُسلم لیڈر ہوتا اور اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام فکر و عمل کے عوام میں پھیلا کر ان کے اندر سب سے بڑے محبوب یعنی خداوندِ عالم کی وفاداری مستحکم کر دیتا، تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ آج

کچھ اور ہوتی۔ اور آج بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ کام کرے تو تاریخ اپنا راستہ بدلنے پر اب بھی مجبور ہو سکتی ہے۔

ابو الاعلیٰ
۸ر جولائی ۱۹۴۰ء

رباعی

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

اختر شیرانی

ٹیپو سلطان

(علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم)

آں شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂؐ بدر و حنین
فقرِ سلطان، وارثِ جذبِ حسینؑ
رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

تُو

تاج و تخت ٹھکرا کر
شیر کی طرح میدان میں کُودا
اَور
سپاہی کی طرح مَر گیا
موت بہتر ہَے اَیسی رُسواکُن زِندگی سے
جو
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو ؛

مرثیہ

مترجمہ

(مولینا عبدالمجید سالک مرحوم)

خوف کی اس عمیق رات میں
تیرا شعلہ بجھا دیا گیا!
اقتدارِ شاہانہ کا عصا تیری قوم کے
ہاتھ سے چھن گیا
بے شمار جگر دار غازی
سب شہید ہوئے
صرف وہی باقی ہیں
جو آج تیرا ماتم کر رہے ہیں!
جب ہنگامۂ کارزار کے خونیں بادل
منڈلا رہے ہوں ہمارے سروں پر
تب!
موت بہتر ہے ایسی رُسواکُن زندگی سے
جو،
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو۔
اے آسمانِ جہاد کے ستارے!
تو غروب ہو گیا
ان ذلیل انسانوں کی طرح نہیں
جنھیں ناموری نے
طوفانِ پیکار کی لہروں میں
غرقِ فراموشی کر دیا،
جو خاکِ مذلت پر سربسجود ہو گئے،
مجاہدوں کی صف میں رہ کر جان دینا
ایسے لوگوں کے ساتھ زندہ رہ کر
فرمانروائی کرنے سے

بہتر ہے ہزار درجہ!
موت بہتر ہے ایسی رُسوا کُن زندگی سے
جو،
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو
نہیں!
تُو خاک و خُون کے بستر پر
اس فروزاں آفتاب کی طرح ہو گیا
جس کی غضب ناک شعاعیں
اس وقت نمودار ہوں
جب اس کا دورہ ختم ہونے والا ہو
جس مقام پر موت کے جاں سوز
شعلوں کی لپک،
خُون آشام تلواروں کی زہرہ گداز جھنکار
ہے
فضا لبریز ہو رہی تھی
اور
مرنے والے آخری سانس توڑ رہے تھے
سُرخرُو ہو رہی ہے
دُشمن کے لہُو سے

تو،
تاج و تخت کو ٹھکرا کر
شیر کی طرح میدان میں کُودا
اور سپاہی کی طرح مر گیا
موت بہتر ہے ایسی رسوا کُن زندگی سے
جو
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو۔
تیرا بہادر اور قوی باپ
خوش تھا
کہ
اس کی رُوحِ جہاد
تجھ میں تڑپی
اُس کے جنتی لبوں پر مُسکراہٹ تھی!
اُس نے دیکھا کہ تُو دشمن پر آخری وار
کر رہا ہے
اور تیری تلوار!
ایک ہار گُوندھا
اپنی
زمردیں خلوتوں میں

پھر اُس نے دیکھا کہ تو
سو رہا ہے
بہادروں کی طرح
اور تیرے سینے پر ہیں زخم
گُل رنگ
موت بہتر ہے ایسی رُسوا کُن زندگی سے
جو
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو!
اہلِ جنّت نے، شہید کے لئے
سدا بہار پھُولوں کا

نخلِ طُوبیٰ کے نیچے
فردوس کی جادُو نگاہ حُوروں نے
خُلدِ بریں کی شفاف فضاؤں میں
رُومال ہلا ہلا کر
خیر مقدم کیا
مجاہدین کے سب سے بڑے سردار
سلطان شہید کا!
موت بہتر ہے ایسی رُسوا کُن زندگی سے
جو
اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو!

مقالات

ثالثه

اِتّحادِ بین المُسلمین کا سب سے پہلا داعی

جس نے اِس حقیقت کو سب سے پہلے محسُوس

کیا کہ دُنیا بھر کے مُسلمانوں کی نجات کا

راز آپس کے اتّحاد اور یگانگت

میں مُضمر ہے۔

سُلطانُ ابُوالفتح علی ٹیپُو رح

خاندانی حالات

شہیدِ حریت سلطان ابُو الفتح ٹیپُو رح کا تعلق جیالے سپاہیوں کے وطن پنجاب سے ہے، آپ کے پڑدادا نقل مکانی کر کے گلبرگہ میں آبسے تھے۔ دادا نے راجہ میسور راج وڈیار کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور انکے انتقال کے بعد سلطان کے نامور والد اور سلطنتِ خداداد کے بانی سلطان حیدر علی نے بھی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے ہی زندگی کی ابتدار کی۔ قدرت کی طرف سے حیدر علی کو وُہ تمام سپاہیانہ اوصاف ودیعت ہوئے تھے جو ایک کامیاب انسان کے لئے ضرُوری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے گنتی کے چند دِنوں میں اپنی دلیری، تدبر اور خلوص کی وجہ سے راجہ کو اپنی اہمیت کا احساس دِلا دیا اور اُس نے اُنھیں ڈنڈیگل کا گورنر بنا دیا۔

دِلّی کی مغلیہ سلطنت کے کمزور پڑ جانے کی وجہ سے مرہٹے اپنے آپ کو بہت بڑی فوجی طاقت محسُوس کرنے لگے تھے اور اُن کے سر پھرے سردار پُورے ہندوستان

پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ شہنشاہ دِلّی اور دُوسرے چھوٹے موٹے مسلمان حکمرانوں کو پریشان کرنا تو ان کا خاص مقصد تھا ہی لیکن ہوسِ مُلک گیری نے انھیں اپنے ہم مذہب ہندو حکمرانوں کا بھی دشمن بنا دیا تھا۔ اُن دِنوں میسور ایک چھوٹی سی کمزور ریاست تھی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے اسے تر نوالہ سمجھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ راجہ کو خطرے کا احساس ہُوا تو اُس نے غور و فکر کے بعد حیدر علی کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر مرہٹوں کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ اور اس کی اُمید کے عین مطابق حیدر علی نے اپنے حُسنِ تدبّر اور بہادری کی وجہ سے مرہٹوں کو میسور کی سرحد سے باہر نکال دیا لیکن دشمن کے خطرے سے نجات حاصل کرتے ہی دربارِ میسور میں حیدر علی کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ راجہ میسور کی ایک رانی اور ایک ہندو سردار کھنڈے راؤ نے اس سازش میں نمایاں پارٹ ادا کیا اور حیدر علی کے مُسلمان ہونے کو بہانہ بنا کر خود راجہ کو بھی اسکی طرف سے متوحّش کر دیا۔

سب کے صلاح مشورے سے یہ طے پایا کہ جب حیدر علی سرنگاپٹم آئے تو اس کی اقامت گاہ کو چپکے سے آگ لگا دی جائے لیکن کسی طرح حیدر علی کو اس سازش کا علم ہو گیا اور وہ اپنے بیوی بچّوں کو خدا کے سپرد کر کے رات کی تاریکی میں سرنگاپٹم سے نکل گیا۔ اپنے ذلیل منصوبے میں ناکام رہنے کے بعد کھنڈے راؤ اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا اور راجہ کی اجازت سے فوج کو حیدر علی کے گرفتار کرنے کے لئے روانہ کیا۔

کوئی معمولی آدمی ہوتا تو اس مصیبت کے وقت ہمت ہار بیٹھتا لیکن حیدر علی

نے اپنے چند جانثاروں کو جمع کر کے میسور کی فوج کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دیکر سرنگاپٹم پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح راجہ میسور کی ناعاقبت اندیشی، مذہبی جنون، اور احسان فراموشی کے باعث قدرت نے مظلوم رعایا کی دیکھ بھال اور خبر گیری کا فرض حیدر علی کے سپرد کیا اور وہ سپہ سالار سے میسور کا تاجدار بن گیا۔

ٹیپو کی پیدائش دنیا کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح سلطان ٹیپو کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مؤرخین نے اختلاف کیا ہے۔ انگریز مصنفوں نے سلطان کا سنِ پیدائش ۱۷۵۳ء لکھا ہے۔ صاحبِ "حملات حیدری" کے نزدیک سلطان ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا۔ لیکن درست یہ ہے کہ اس عظیم الشان انسان نے دسمبر ۱۷۵۱ء میں حیدر علی کی چہیتی بیوی فخر النساء کے بطن سے جنم لیا:

حلیہ قد پانچ فٹ آٹھ انچ، گٹھا ہوا مضبوط جسم، چہرہ پُر گوشت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کھڑی ناک جو کسی قدر آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

تربیت یہ بات ظاہر ہے کہ جس بچے نے حیدر علی جیسے سپاہی اور مدبّر کے سائے میں پرورش پائی ہو گی اس کے دل و دماغ میں کیا کچھ صلاحیتیں پیدا نہ ہو گئی ہوں گی۔ چنانچہ مخالفین تک نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ خطاطی۔ حکمت۔ شہسواری۔ تیغ زنی اور دیگر علوم و فنون میں اُس کا درجہ نہایت بلند تھا وہ بےمثال حوصلے اور بے داغ عزم کا مالک تھا۔ اس کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں کہ اگر حالات سازگار ہوتے اور قوم اسکا ساتھ دیتی تو عین ممکن تھا کہ انگریزوں سے مغلوب ہونے کی جگہ اُسکا پرچم انگلستان پہ لہراتا۔ وہ بلند پایہ مصنف تھا فنونِ حرب پر

"فتح المجاہدین" جیسی جامع کتاب لکھ کر اُس نے ثابت کیا)۔ بہترین مقرر تھا اعلیٰ درجے کا منتظم تھا۔ بے مثال سیاست داں، اور عظیم الشان سپاہی تھا۔

فوجی قابلیت

مشہور ہے کہ چھ سال کی عمر سے لے کر وفات تک ٹیپو اپنے نامور باپ کے ہمرکاب ہر لڑائی میں شریک رہا۔ اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میدان جنگ کے نشیب و فراز کے متعلق اُس کی معلومات کس قدر وسیع ہوں گی۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ چھ سال کی عمر میں سُلطان کی لڑائیوں میں شرکت کو محض افسانہ خیال کریں۔ لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صرف ۱۶ سال کی عمر میں اُس نے حیدر علی کی فوج کی قیادت سنبھال لی تھی، میسور کی پہلی لڑائی کے دوران میں حیدر علی کرناٹک کے مقام پر لڑ رہا تھا۔ کہ انگریزوں نے اچانک منگلور پہ حملہ کر دیا۔ حیدر علی کا کرناٹک کے محاذ سے ہٹنا اس وقت بے حد خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا اس لئے اس نے اپنے سولہ سالہ بیٹے ٹیپو کو انگریزوں کی سرکوبی کے لئے منگلور روانہ کیا اور اُس کمسن سالار نے انگریزوں کو ایسی کھُلی شکست دی کہ اُنھیں مُدتوں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس کے علاوہ سُلطان کی فوجی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وُہ بیک وقت انگریزوں۔ مرہٹوں اور نظام تین دشمنوں سے برسرِ پیکار رہا اور یہ تینوں اُسے اس وقت تک عاجز نہ کر سکے جب تک بزدل دشمنوں کی طرح شیر کی جسارت کی جگہ لومڑی کی مکاری سے کام نہ لیا۔ آج ہر انصاف پسند انسان محسوس کرتا ہے کہ انگریز جاسوس اور میسور کے غدار دوستی کے پردے میں سلطان

کو دھوکہ نہ دیتے تو اس کا مستقبل مختلف ہوتا ۔

شادی

مشرقی روایات کے مطابق سلطان ٹیپو کی شادی کے مسئلے پر بھی نزاع ہُوا ۔ اُس کی والدہ کی خواہش تھی کہ اس کی شادی خاندان کے ایک بزرگ لالہ میاں شہید کی دُختر رقیّہ بانو سے ہو اور حیدر علی امام بخش نائطہ کی لڑکی سے رشتہ کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ ایک ہی دِن دونوں لڑکیوں سے سلطان ٹیپو کا نکاح پڑھا یا گیا ۔

تخت نشینی

دسمبر ۱۷۸۲ء میں سلطان حیدر علی کا انتقال ہُوا تو ٹیپو میدانِ جنگ میں تھا ۔ حیدر علی کے انتقال کی خبر اس کے لئے بہت پریشانی کا باعث بنی ۔ ایک طرف دشمن سے مقابلہ اور دُوسری طرف یہ خطرہ درپیش کہ کہیں اُمراء کی غدّاری سے تخت پر کسی غاصب کا قبضہ نہ ہو جائے! آخر غور و فکر کے بعد خُفیہ طور پر سُلطان سرنگا پٹم پہنچا اور تخت نشینی کی رسُوم ادا ہوتے ہی محاذ پر واپس آگیا ۔ اس وقت سُلطان کی عمر ۳۰ سال تھی ۔

نصبُ العین

سلطان ٹیپو کی پُوری زندگی تھکا دینے والی جدّ و جہد اور گوناگوں مصائب کی لمبی داستان ہے، خاص طور پر تخت پر بیٹھنے کے بعد تو اس کا سارا وقت آگ اور خُون سے کھیلتے گزرا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ اس بات پر تُل گئے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکتا ہے اسے پریشان کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان حالات سے گھبرا کر ہار مان لے یا ان دشواریوں کی وجہ سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آخر انگریزوں کو اُس کی ذات سے اِس قدر پرخاش کیوں تھی ؟

ملکی اور غیر ملکی مؤرخوں کے نزدیک اس سوال کا سب سے معقول جواب یہ ہے کہ انگریز بہر قیمت ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور ٹیپو ان کے راستے کا سب سے وزنی پتھر تھا اسلئے انھوں نے اپنی پوری قوت اُسے ختم کر ڈالنے کے لئے وقف کر دی۔ یہ جواب یقیناً درست ہے لیکن اسے بالکل درست اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب ہندوستان کا لفظ کاٹ کر ایشیا لکھ دیا جائے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ جو ریشہ دوانیاں کر رہے تھے وہ صرف ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے نہ تھیں بلکہ پورا ایشیا ان کی نگاہوں میں تھا۔ جیسا کہ وہ اپنے پروگرام پر چل کر اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

ٹیپو سلطان ان کے اس خفیہ منصوبے کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ایشیا اور افریقہ کی اسلامی سلطنتوں کو متحد کر کے اس سفید خطرے سے نجات دلائے۔ لوگ اُسے بہت بڑا محبِّ وطن کہتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک محبِّ وطن ہونے سے کہیں زیادہ وہ محبِّ اسلام تھا اور اس کا یہی جذبہ تھا جس نے فرزندانِ صلیب کو اس کا شدید مخالف بنا دیا تھا۔ ہمارے اس خیال کی تائید سلطان کے اکثر خطوط اور تحریروں سے ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کا یہ جذبہ چھلکا پڑتا ہے، اپنے ایک فوجی عہدہ دار قطب الدین خاں کو مخاطب کر کے شاہ عالم شہنشاہ دلّی کے متعلق لکھتا ہے:

"خطبہ میں سب سے پہلے خدا کی حمد اور پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہو اور اسکے بعد ایک ایسے بادشاہ کا نام لیا جائے جس کی زندگی کا مقصد یہ ہو کہ اسلام

کی خدمت کرے اور اس کی شان و شوکت بڑھانے کے لئے اپنی جان دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہے' ایسے سلطانِ دین کا نام خطبہ میں پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں' ان فاتر العقلوں کو کیا کہا جائے جو شاہ عالم کا نام خطبہ میں پڑھتے ہیں جبکہ اس کی اصلی حالت یہ ہے کہ وہ سندھیا مرہٹہ کا غلام بن کر پندرہ ہزار روپیہ پنشن لیتا ہے۔"

ایک اور مسلمان رئیس محمد بیگ خان ہمدانی کو لکھتا ہے :-

"آپ نے سُنا ہوگا کہ آپ کے اس دوست نے کس طرح بے دین نصرانیوں کی سرکوبی کی ہے' شک نہیں کہ اس کی تفصیلات آپ تک پہنچ چکی ہونگی اب فی الوقت میں بعض مسلمان رئیسوں کی سرزنش کر رہا ہوں جو شریعتِ اسلام کے خلاف کافروں کے ساتھ اتحاد کر چکے ہیں جس کی وجہ سے میں نے حال میں خدا کے احکام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی احادیث قلمبند کر کے تمام ملک میں بطور پمفلٹ تقسیم کئے ہیں جن کی ایک نقل آپ کے ملاحظے کے لئے ارسال ہے۔

ہمارے اپنے دینِ پاک کی مدد کے لئے ضروری ہے کہ تمام مسلمان متحد ہو جائیں' اور کافروں کی سرکوبی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں تاکہ دینِ محمدؐ دِن بدن ترقی کرے۔"

اس کوشش کے علاوہ جو سلطان ٹیپو نے ترکی۔ مصر۔ افغانستان اور ایران وغیرہ اسلامی ملکوں کو متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے کی۔ اس کے تمام حیثیتوں سے زیادہ مسلمان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنی مملکت کی حدود میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی پوری پوری کوشش کی۔

اپنی فوج کے ایک فرانسیسی افسر موسیو لالی کو لکھتا ہے:

"آپ کو چاہیئے کہ اپنے کیمپ میں ایک سے زیادہ شراب کی دُکان کی اجازت نہ دیں اور اس دکان پر ایک پہرہ دار مقرر کر دیا جائے کہ سوائے یوروپین لوگوں کے جو آپ کے ماتحت ہیں، دیسی باشندوں کے ہاتھ شراب فروخت نہ کرے ہماری اپنی فوج میں اس قسم کی دُکان کی اجازت نہیں دی جاتی۔"

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے سلطان کے دِل میں کس قدر تڑپ تھی اور دراصل یہی تڑپ اس کی شہادت کا باعث بنی۔

سلطان حیدر علی اور انگریزوں کی چھیڑ چھاڑ چلی آ رہی تھی لیکن سلطان ٹیپو کے تخت نشین ہونے کے بعد تو اس چھیڑ چھاڑ نے خوفناک حملوں کی صُورت اختیار کر لی۔ سُلطان نے بھی پُوری قوت سے ان کے حملوں کا جواب دیا لیکن اپنوں کی غداری کے باعث ایک پیش نہ گئی اور آخر مئی ۱۷۹۹ء میں آزادی اور اسلامی اخوت کا یہ آفتاب صرف ۴۸ سال کی عمر میں غرُوب ہو گیا۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیاں - نظام اور مرہٹوں کی بے حمیتی اور صادق و پورنیا کی غداری تاریخ کے گھناؤنے واقعات ہیں جن کا حال آپ اس کتاب کے اگلے اوراق میں ملاحظہ کریں گے۔

ٹیپو سُلطان

جناب خواجہ احمد حسن صاحب

حُلیہ :- گندمی رنگ ، خمدار ناک ، آنکھیں پُر آب، روشن اور بڑی بڑی ، چہرے کے خدّو خال نہایت نازک مگر باوقار، ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے ، گردن پر بل پڑتے تھے - قد پانچ فٹ آٹھ انچ - سُلطان ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا ۔

لباس :- سلطان کا لباس بالکل سادہ اور شرعی ہوتا تھا - اپنی دستار پر سفید رومال باندھتا تھا - کمر کی پیٹی میں ایک پیش قبض اور تلوار رہتی تھی ۔

روزانہ مشاغل :- سلطان علی الصبح بیدار ہوتا اور نماز صبح کے بعد ایک گھنٹہ تک تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتا - اس کے بعد توشک خانہ میں جواہرات کا معائنہ کرتا - یہاں سے محل جاکر ناشتہ کرتا - اس وقت سلطان کے ساتھ تین شہزادے اور ایک منشی ہوتا - اکثر خطوط ناشتے کے وقت لکھوائے جاتے - غذا میں زیادہ تر چاول اور دودھ ہوتا - ناشتے کے بعد فوج کا معائنہ کیا جاتا - محل میں واپسی پر باہر کی رپورٹیں سُنتا تھا - رات کے کھانے پر بڑے شہزادے اور افسرانِ سلطنت ضرور موجود ہوتے - کھانے کے بعد چہل قدمی کی جاتی جس کے بعد سلطان نیند آنے

تک کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ سلطان دِن میں صرف دو وقت کھانا کھاتا۔

غیرت و حمیت:۔ جون ۱۷۹۲ء میں میسور کی تیسری لڑائی کے بعد سلطان کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی اور لارڈ کارنوالس کو ایک بڑا علاقہ اور دو لڑکے یرغمال دینے پڑے۔ اس دِن سے لے کر شہادت کے دِن تک سلطان چارپائی پر نہیں سویا۔ زمین کے فرش پر کھدر کے ایک موٹے کپڑے پر سوتا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا چارپائی پر سونا حرام ہے۔

علمی قابلیت:۔ سلطان فنِ کتابت، طِب، تجارت، مذہبی و فوجی معاملات اور دیگر بے شمار اُمور میں یکساں رائے دے سکتا تھا۔ کرنل کرک پیٹرک اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ اِسقدر مختصر اور پُرمعنی ہوتی کہ ایک ایک لفظ سے کئی معنی نکلتے تھے۔ اس کی تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے۔ الفاظ میں تحکم ہوتا تھا۔"

مسٹر کیمبل لکھتا ہے:

"سلطان نہایت آسانی سے نظم و نثر لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک خاص شان پائی جاتی تھی۔"

جنگی قابلیت:۔ سلطان نے بچپن ہی سے فنِ حرب میں کمال پیدا کر لیا تھا

اپنے باپ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوا کرتا اور بہادری کے جوہر دکھا کر دادِ شجاعت لیتا۔ بورنگ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"سلطان وزارت کا کام کر سکتا تھا۔ سپہ سالاری میں طاق تھا۔ امیرالبحر تھا اور سب قسم کے علوم و فنون میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ اس کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ جس وقت جنگی بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے امیرانِ یم کی جماعت میں جہازوں کے نمونے بھیج دیئے کہ ان نمونوں کے مطابق جہاز تیار کئے جائیں۔ جہازوں کے پیندوں کے واسطے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ تانبے کے بنائے جائیں نیز جہازوں کی لکڑی کے لئے ایک جنگل وقف کر دیا۔"

زہد و تقویٰ:۔ سلطان نماز کا اس قدر پابند تھا کہ جب مسجدِ اعلیٰ کے افتتاح کے وقت سوال پیدا ہوا کہ پہلی نماز کون پڑھائے! اس وقت بڑے بڑے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ طے پایا کہ جو شخص صاحبِ ترتیب ہو وہ امامت کرے۔ کچھ دیر تک مجمع میں خاموشی کا عالم طاری رہا اور جب کوئی بھی صاحبِ ترتیب نہ نکلا تو سلطان نے کہا:

"الحمدللہ

میں صاحبِ ترتیب ہوں۔"

چنانچہ پہلی نماز کی امامت خود سلطان نے کی۔

صاحبِ نشان حیدری لکھتے ہیں :

"سلطان اس قدر کامل الحیا تھا کہ سوائے اس کے گھٹنوں اور کلائیوں کے اس کے جسم کو کبھی کسی نے برہنہ نہیں دیکھا ۔ یہاں تک کہ حمام میں بھی وہ اپنے تمام جسم کو چھپائے رکھتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اس اعتبار سے دُنیا میں سلطان حیاء کی دُوسری حیرت انگیز مثال تھا"

طرزِ گفتگو:۔ سلطان کا طرزِ گفتگو ملائم اور شیریں تھا۔ بات کرتا تو معلوم ہوتا گویا پھول برس رہے ہیں ۔ سلطان کی زبان سے کبھی کوئی فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا ۔ نہایت سوچ سمجھ کر بات کرتا ۔ اس کی زبان پر اکثر یہ جملہ رہتا تھا :۔

"گیدڑ کی سَو سال کی زندگی سے شیر
کی ایک دِن کی زندگی اچھی ہے"

”شیر کی ایکؔ دِن کی زِندگی گیدڑ کی
سَوؔ سال کی زِندگی سے بہتر ہے۔“

ہندو مسلم اتّحاد کا مجسّمہ

(گاندھی جی)

میسور کا بادشاہ فتح علی ٹیپو شہید غیر ملکی مؤرخوں کی نظر میں ایک ایسا مسلمان تھا جس نے اپنی ہندو پرجا کو زبردستی مسلمان بنایا۔ لیکن یہ سب بہت بڑا جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں سے اس کے تعلّقات نہایت ہی دوستانہ تھے۔ اس کے کارنامۂ زندگی کی یاد دل کے اندر خوشی اور مسرّت کا طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہندو اور مسلمان اپنے غیر ملکی دشمن کو جو اُن کے دروازے پر ڈیرا جمائے ہوئے تھا، بھول کر آپس میں ایک دوسرے

کے ساتھ طاقت آزما تھے ۔ اس عظیم المرتبت سُلطان کا وزیرِ اعظم ایک ہندو تھا اور ہمیں نہایت ہی ندامت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس نے فدائے آزادی کو دھوکا دے کر دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

میسور کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے پاس اس وقت سلطان کے وہ تیئس۲۳ خطوط موجود ہیں جو سلطان نے سرینگری مت کے شنکر اچاریہ کو لکھے تھے ۔ یہ خط کنڑی زبان میں ہیں ۔ ٹیپو کو ایک خود مختار حکمران ہونے کے باوجود اس چیز کا کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ ساہوکاروں کو عربی حساب کتاب لکھنے کے لئے مجبور کرے ۔ بلکہ اُس نے خود اپنی مُلکی زبان میں شنکر اچاریہ کے خط کا جواب دیتے ہوئے دُعا یا تپسّیا کی درخواست کی تھی اور اپنے مُلک کی بھلائی اور ساری دُنیا کی بہتری کی دُعا چاہی تھی ۔ اور سوامی جی کو لکھا تھا کہ آپ میسور جلد واپس آئیں کیوں کہ بزرگوں کے قدم کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور فصل اچھی ہوتی ہے ۔ یہ خط اس قابل ہے کہ زرّیں حروف میں لکھا جائے ۔

ٹیپو نے ہندو مندروں کے لئے نہایت فیاضی سے جائدادیں وقف کیں اور خود ٹیپو سُلطان کے محلات کے قریب شری ونکٹا رامنّا سرنیو اس اور شری رنگناتھ کے مندروں کی موجودگی سُلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہیں ۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہیدِ قوم سلطان شہید جس سے بڑا شہیدِ مُلک و قوم کوئی دوسرا نہیں ، اپنی عبادت میں ہندوؤں کی گھنٹیوں سے پریشان نہ ہوتا تھا ۔ ٹیپو آزادی کے ساتھ جنگ کرتا ہوا شہید ہوا۔

مگر اُس نے دُشمن کی اطاعت گوارا نہ کی ۔
ہمیں بھی سُلطان ٹیپو شہید کے اس الہامی مقولے کو یاد رکھنا چاہیئے :
"شیر کی ایک دِن کی زِندگی گیڈر کی سَو
سال کی زندگی سے بہتر ہے ۔"

دُنیا

میں بہت سی عظیم المرتبت
ہستیاں ایسی گزری ہیں کہ وہ بظاہر
ناکام رہیں مگر پھر بھی دُنیا نے اُن کے سر پر عظمت کا
تاج رکھا اور اُنکی یاد کو قلوب میں جگہ دی ہینی بال، امام حسینؓ،
نپولین اعظم، انور پاشا اور سُلطان ٹیپو رح
اِنہی افراد میں سے
ہیں ۔

حضرت سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ

مولینا محمد علی صاحب ایم۔ اے (کنیٹب) رئیس التجار مدراس

عمرہا در خویش می پیچد وجود
تا یکے بے تاب جاں آید خرود

دُنیا کی تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر عظیم الشّان انسان کامیاب ترین انسان بھی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی عظیم المرتبت ہستیاں ایسی گزری ہیں کہ وہ بظاہر بالکل ناکام رہیں مگر پھر بھی دُنیا نے ان کے سر پہ عظمت کا تاج رکھا اور ان کی یاد کو قلوب میں جگہ دی۔ ہنی بال۔ امام حسین رضہ۔ نپولین اعظم۔ انور پاشا۔ اور سُلطان ٹیپو انہی افراد میں سے تھے جن کی ناکامی ان کی

شہرت اور بقائے دوام کو کم نہ کر سکی۔ سلطان ٹیپو ان نادرۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے جن کا ثانی صدیوں میں پیدا نہیں ہوتا اور گو ان کی زندگی بظاہر ناکام رہی مگر اُن کی ناکامی ان کی عظمت کو کم نہ کر سکی۔ آپ میں سے اکثر اصحاب کو جو عقیدت سلطان شہید سے ہے وہ شنیدہ پر مبنی ہے۔ لیکن میرے دل میں ان کی جو عقیدت و محبّت ہے وہ عین الیقین پر مبنی ہے۔ کیونکہ مجھے سالہا سال جنوبی ہند میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں میسور، سرنگاپٹم، بنگلور، کرگ، ارکاٹ، تینجور، ترچناپلی، ڈنڈیگل، ٹراونکور اور مالابار کے ہر گوشے سے واقف ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں کا چپہ چپہ سلطان شہید رح کی عظمت کی پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے اور ایک فاتح کینہ پرور دشمن کی ہر ممکن کوشش کے باوجود ہندوستان کے اس مایۂ ناز سپوت کی یاد ابھی تک جنوبی ہند کے ہندو مسلم دونوں کے قلوب میں تازہ ہے اور وہاں کا ہر گوشہ سلطان مرحوم کی عدیم المثال رواداری، بے نظیر وسعتِ قلب اور لاثانی بے تعصبی کی زندہ شہادت ہے۔ اگر جنوبی ہند میں سلطان شہید رح نے مساجد کو جاگیریں عطا فرمائیں تو ان سے زیادہ وہاں کے ہندو مندروں کو بھی جاگیروں سے نوازا اور ان کے پنڈتوں اور پروہتوں کو نوازش ہائے شاہانہ سے سرفراز فرمایا۔ ان لوگوں کے پاس سلطان کے وہ فرامین اب تک موجود ہیں۔ ان فرامین کے ایک ایک حرف سے اس شاہِ عالی نژاد کے تدبّر، وسعتِ قلب اور رعایا پروری کا پتہ چلتا ہے اور آج

جو لوگ اسے ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے کا ملزم ٹھیرا رہے ہیں اور اس کی بیدادگری کے فرضی افسانے شائع کرا رہے ہیں وہ اپنی ڈیڑھ سو سالہ حکومت میں ایک واقعہ بھی ایسی مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا پیش نہیں کر سکتے جس میں انھوں نے ہندو مذہب اور اسلام کی ویسی ہی سرپرستی کی ہو جیسی کہ عیسائیت کی وہ کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔

حضرات! شاہِ شہید رح کے زیرِ نگیں علاقے اور اس کے ملحقہ علاقے کو سرسری نظر سے دیکھ لینا ہی سلطان کی عظمت کے لئے کافی ہے۔ ان دونوں علاقوں کا تمدن اور طرزِ رہائش اور بود و باش میں اسقدر بیّن فرق ہے کہ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ حکومت بھی ابھی تک ان دونوں علاقوں کو ثقافتی اعتبار سے ایک سطح پر نہیں لا سکی۔ میرے ایک ہندو دوست جو ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے، کہا کرتے تھے کہ اگر جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو پیدا نہ ہوا ہوتا تو یہاں کسی کو کھانا کھانا اور کپڑا پہننا نہ آتا۔ ان کی حالت وہی رہتی جو راجہ رام چندر کے زمانے میں تھی اور اب بھی ہماری مذہبی تصاویر اور ہنومان جی کے بت جس کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جس کا جی چاہے، جنوبی ہند اور مالابار کے بعض حصوں میں جا کر دیکھ لے۔ سلطان نے ہم لوگوں کو (یعنی جنوبی ہند کے رہنے والوں کو) جانوروں سے آدمی بنایا۔ آج مدراس اور جنوبی ہند میں سلطان کی داد و دہش، معدلت گستری اور انصاف پسندی کی سینکڑوں روایات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی اپنے اس فردِ فرید کے ساتھ انصاف نہ کیا۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان تمام روایات کو جمع کیا جائے انہیں منقح کرکے صحیح روایات کو یکجا کیا جائے اور مواد بھی جس قدر مل سکے، اس کی چھان بین کرکے سلطان کی شان کے شایاں ایک بائیوگرافی مرتب کی جائے۔ زمانے کا بے رحم ہاتھ سلطان کی یادگاروں کو ذہول ونسیان کی نذر کر رہا ہے۔ ابھی چند باقی ہیں۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ اپنے اس بطلِ عظیم کی یادگار کو واقعی زندہ رکھیں تو انہیں چاہیئے کہ اس طرف فوری توجہ کریں، ورنہ ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مُدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

حضرات! مجھے معاف فرمایئے اگر میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ سلطان شہید رح کی حقیقی یادگار منانے کا طریقہ وُہ نہیں جو آپ نے اختیار کیا ہے اور اس کی بنیاد ہی دراصل غلط عقیدہ پر مبنی ہے۔ کسی بطلِ جلیل کی یادگار جلسوں اور تقریروں سے نہیں منائی جا سکتی بلکہ اسکی یادگار منانے کے دو ہی طریق ہیں۔ ایک تو وُہ جس کا میں ابھی ذکر کر آیا ہوں۔ وُہ تو صرف مؤرخ کا طریق ہے۔ لیکن کسی عظیم الشّان شخصیت کی یادگار منانے کا حقیقی طریق یہ ہے کہ اس کے آئیڈیلز (Ideals) کی پیروی کی جائے اور اس کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی جائے۔ جس قسم کے اجتماعات کو ہم یادگار منانے کا ذریعہ

سمجھے ہوئے ہیں۔ ان میں قوت اور روپیہ تو بہت خرچ ہوتے ہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے وُہ بہت کم مفید ثابت ہوتے ہیں اور ان اجتماعات کو دیکھ کر جن کی آج کل بہت کثرت ہو رہی ہے، مشہور ضرب المثل یاد آتی ہے کہ "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا"۔ فارسی میں "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" اسی کے لیئے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرے سے اس قسم کی برسیوں کے منانے کی مناہی کر دی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت سردارِ عالم صلعم کی برسی منانے کی رسم بھی عجمیوں کی بدعت ہے جس کا وجود اسلام کے پہلے چھ سو سال میں سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔ دراصل زندہ قومیں اپنے ہر عمل سے حرکت و زندگی کا ثبوت دیتی ہیں اور مُردہ قومیں مُردہ پرستی کر کے اپنا دِل خوش کرتی رہتی ہیں۔

حضرات! مجھے اجازت دیجیئے اگر میں بطور جملۂ معترضہ کے اس اہم امر پہ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں یہ مرض اب وبائی صورت اختیار کر گیا ہے اور ان کے اعمال دیکھ کر علامہ اقبال مرحوم کا مشہور شعر یاد آتا ہے ؎

جو تھا ناخُوب، بتدریج وہی خُوب ہُوا
کہ غلامی سے بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

سب سے پہلی بات جو اس ضمن میں آپ کو یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ اِسلام نے شخصیت پرستی اور اعاظم پرستی کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ دیا۔ وُہ صِرف اصول پرستی سکھلاتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ بڑے آدمی اِس

لئے بڑے ہیں کہ وُہ کسی اصول پہ زندہ رہے - اس کے لئے جئے اور اُسی کے لئے مَرے - اس لئے تم بھی ان کے اصُول کی عزت کرو- اسی پر جیو اور اسی پہ مَرو - اس لئے اس نے اعاظم پرستی کی جگہ اتّباع کو تجویز کیا - یعنی کسی بڑے آدمی کی یادگار منانے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اس کی اچھی باتوں میں اس کی پیروی کی جائے - اس کی لغزشوں سے سبق حاصل کیا جائے - چُونکہ دُنیا کی عظیم الشان ترین شخصیت جسے "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کا تاجِ رفعت بارگاہِ خداوندی سے مِل چُکا ہے، اس بات کی سب سے زیادہ حقدار تھی کہ آپؐ کی یادگار سب سے زیادہ منائی جائے - اس لئے خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی فرض قرار دے دی اور آپؐ کے اتباع کو ایمان کا لازمی جزو قرار دے دیا - گویا اسلام آپ سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ایک دن تو آپ دھوم دھام سے حضورِ صلعم کی یادگار منائیں - بڑے بڑے جلسے کریں جن میں دُھواں دھار تقریریں ہُوں اور جلوس نکالے جائیں اور پھر سال کے باقیماندہ ۳۶۴ دِن خوابِ خرگوش میں گزار دیں - نہیں سال کے ۳۶۵ دِنوں میں سے ۳۶۵ دِن اور ہر دِن کے چوبیس گھنٹوں میں سے چوبیس گھنٹے ایک مُسلمان کے سامنے آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہونا چاہیئے تاکہ آپؐ کی یادگار اس کے ہر قول، ہر عمل اور ہر فعل سے نمایاں ہو - پھر الامثل فالامثل - جو کوئی جتنا آپؐ کے قریب تر ہے اُسی قدر زیادہ وُہ پیروی کے لائق ہے - گویا اگر آپ صدیقِ اکبرؓ، فاروقِ

اعظمؒ، ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ بن حنبل، بخاریؒ، مسلمؒ یا ہندوستان کے بادشاہوں میں سے شیر شاہ سوری، اورنگ زیب عالمگیر یا سلطان ٹیپوؒ وغیرہ ہم کی یادگار منانا چاہتے ہیں تو اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ جس اصول کے لئے وہ زندہ رہے اور جس کے لئے انھوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ اس اصول کے لئے آپ بھی اپنی جانِ عزیز قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور جس کام کو انھوں نے شروع کیا تھا اُسے آپ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

اِس لئے اے عزیزانِ من! ذرا سوچو اور غور کرو۔ آپ کے عزم نیک اور ہمتِ بلند کی میرے دِل میں حقیقی عزّت ہے مگر اسے کسی اچھی جگہ صرف کیجئے۔ مسلمانوں کی قوم آج تنزّل کے عمیق ترین گڑھے میں گر چکی ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ سوچ سوچ کر قدم اُٹھائیں۔ یہ نہیں کہ جس نے بلند آواز سے پکارا، اسکے پیچھے ہو لئے۔ آج 'سیرت ڈے' کی تحریک شروع ہوئی تو اُس میں شامل ہو گئے۔ غرض مسلمانوں کے تمام اعمال بس یہی ڈیز (DAYS) یا برسیاں منانے میں صرف ہونے لگے۔ مرزا غالب مرحوم نے مسلمانوں کی اِس بے راہروی کا عجیب نقشہ کھینچا ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قرآنِ حکیم نے اِس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

"کیا تم لوگوں نے یوں ٹھیرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے سبیل لگاویں اور مسجدِ حرام کو آباد رکھنا اس درجہ کا کام ہے، جیساکہ اس شخص کا کام جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں، اور اللہ کا قانون ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔"

(التوبۃ)

حضرات! اس آیت میں قرآنِ حکیم نے صحیح راہِ عمل کی تعیین فرمادی ہے اور قومی غرورِ باطل کی قلعی کھول دی ہے۔ جب کوئی قوم صحیح اعتقاد اور عمل سے یکسر خالی ہوجاتی ہے تو وہ رسوم اور ظواہر اعمال ہی کو حقیقی نیکی اور فوز و فلاح کی کلید تصور کرنا شروع کر دیتی ہے۔ آج مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے کہ اعتقاد و عمل کی حقیقت کو وہ یکسر کھو چکے ہیں اور لے دے کر ان کی اسلامیت اس قسم کے مظاہروں اور رسمی نمائشوں تک ہی محدود ہو چکی ہے۔ صحیح اسلامی روح سے وہ خالی ہیں۔ جو لوگ بظاہر مذہبی آدمی کہلاتے ہیں، ان کی اسلامیت تو قبروں، چلّوں، عُرسوں، مراقبوں، نذروں، نیازوں، محفلوں اور اس قسم کی غیر اسلامی رسُوم میں محصُور ہے اور جو انگریزی خواں ہیں ان کی دوڑ اس قسم کی برسیوں تک ہے۔ لیکن اصلی رُوحِ عمل سے دونوں جماعتیں یکسر خالی ہیں۔ اِلّا ماشاءاللہ! دراصل زندہ قوموں میں ہر وقت سُلطان ٹیپُو رح،

اورنگ زیبؒ عالمگیر اور نپولین جیسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی قوم صحیح راہ عمل پہ گامزن ہوتی ہے تو اس میں کے ہر فرد میں سکندر کا ولولہ اور ٹیپوؒ کی ہمت و فدویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے، ہستئ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ، یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

اس لئے اگر آپ سلطان ٹیپوؒ کی صحیح یادگار منانا چاہتے ہیں تو اپنے میں اس کا ولولہ، اس کی اہمیت، اس کی فدویت و ایثار، اس کا جذبۂ خدمتِ ملک و ملت پیدا کیجئے۔ اس کی اسلامیت، للّٰہیت اور اس کا مقام فی الاسلام پیدا کیجئے۔ انگریزی کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

Lives of great men, all remind
us, We can make our lives sublime.

حضرات! اب میں آپ کے سامنے سلطان شہیدؒ کی زندگی کی بعض مخصوص خصوصیتوں پہ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ لیکن سلطان شہیدؒ کا اصلی مرتبہ پہچاننے کے لئے اور اس کے عظیم الشان کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مغرب کی

تقلید میں ہماری تاریخ واقعات کا صحیح آئینہ نہیں ہے بلکہ پروپیگنڈا کا ایک مؤثر آلہ کار۔ وہ مؤرخ کے ذاتی رجحانات اور پسند و ناپسند کا آئینہ ہے۔ چنانچہ فریڈرک اعظم کے متعلق مشہور ہے، کہ وہ جب تاریخ کی کتاب تفریحاً پڑھنے کے لئے منگوایا کرتا تھا۔ تو اپنے سکرٹری کو حکم دیتا کہ "Bring me my liar". (میرا کذاب میرے پاس لاؤ)۔ اسی طرح نپولین اعظم کہا کرتا تھا کہ "Our history books are fables." (ہماری تاریخی کتب افسانے ہیں) لیکن انگریزی قوم اس معاملے میں دوسری اقوام سے بھی گوئے سبقت لے گئی ہے۔ اپنے دشمنوں کو بدنام کرنے اور تاریخ سے پروپیگنڈا کا کام لینے میں انگریز مؤرخین خوب ماہر ہیں اور انگریزوں کی دیکھا دیکھی بعض غیر مسلم مؤرخ بھی اب تاریخ سے وہی کام لے رہے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے خلاف نفرت پھیلانا، ان کے خلاف فرضی من گھڑت افسانے گھڑنا، اسلامی تمدن اور مذہب کو بدنام کرنا ان کا شیوہ بن چکا ہے اگر آپ میرے بیان کی تصدیق چاہتے ہیں تو تاریخ کی جو کتابیں آجکل سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جارہی ہیں دیکھئے۔ مجھے معاف کیجئے پنجاب اِس بارے میں سب سے بڑا مجرم ہے۔ میں نے اپنی بچیوں کی تاریخ کی کتابیں جو اُن کے نصاب میں داخل ہیں دیکھی ہیں۔ ان کو تاریخ کی کتب کہنا تاریخ کی توہین ہے۔ ان کتابوں کا مقصد مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں میں نفرت پھیلانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ جس قدر بیر بعض

تعلیم یافتہ غیر مسلموں کو مسلمانوں سے اور اسلامی تمدّن سے ہے۔ جاہل عامۃ الناس میں اس کا عشر عشیر بھی پایا نہیں جاتا۔ اور اگر مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت دسواں حصّہ بھی قومی غیرت اور احساس کا ہوتا تو وہ ان مزعود تاریخی کتب کے خلاف ایسا ہی ایجی ٹیشن کرتے جیسا کہ ہندوؤں نے مس میو کی مدر انڈیا کے خلاف کیا تھا۔ سلطان ٹیپو کے خلاف موجودہ ہسٹری کی کتابوں میں ایسا ہی مواد آپ کو ملے گا اور اگر آپ کا انحصار انہی پر ہوگا تو آپ کو صحیح حالات کا علم نہیں ہو سکتا۔

حضرات! سلطان ٹیپو ۱۷۵۳ء میں ایک پنجابی خاندان میں پیدا ہوا سلطان حیدر علی کے پردادا ایک صوفی منش پنجابی درویش تھے جنہیں جنوبی ہندوستان کی شہرت کشاں کشاں وہاں لے گئی اور وہ گلبرگہ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ سلطان ٹیپو کے دادا مہاراجہ میسور کی فوجی ملازمت میں منسلک ہوکر بال بچوں سمیت ریاست میں جا کر بس گئے۔ حیدر علی نے بھی اپنی زندگی کی ابتدار بطور سپاہی کے کی۔ لیکن محض اپنی ذاتی قابلیت اور خداداد ذہانت سے ترقی کرتے کرتے پہلے سپہ سالار فوج بنا اور پھر بتدریج اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ خود راجہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ اور میسور میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اور در حقیقت حیدر علی ہی ریاست میسور کا حکمران اور مختار کُل ہو گیا۔ سلطان حیدر علی کی پوزیشن فی زمانا مسولینی کی پوزیشن سے ملتی جلتی تھی۔ اور اُس نے ریاست میسور کے لئے وہی کام کیا جو مسولینی نے موجودہ اطالیہ کے لئے کیا ہے یعنی اسے ایک مردہ اور منتشر ریاست سے ایک منظم، زندہ اور مضبوط

سلطنت بنا دیا۔ اس نے ریاست اور خود راجہ کو وہاں کے برہمن دیوان سے جس کا عہدہ پشتینی تھا اور ناقابلِ عزل تھا نجات دلائی اور میسور میں غیر برہمنوں کے لئے اپنی قابلیت کے جوہر دکھلانے کا دروازہ کھول کر جنوبِ ہند کو برہمنوں کے ظلم اور تعدّی سے نجات دلائی۔ سلطان ٹیپوؒ اس وقت پیدا ہوئے جب سلطان حیدر علی کے اقبال کا آفتاب عین نصف النّہار پر تھا۔ حیدر علی کی سلطنت اس وقت جنوبِ ہند میں طاقتور ترین سلطنت تھی۔ ایک طرف اس کی حدود مرہٹوں کی سلطنت کی حدود سے۔ دوسری طرف نظام حیدر آباد کی ریاست کی حدود سے۔ تیسری طرف انگریزی سلطنت کے کناروں سے اور چوتھی طرف مالا بار سے ملحق ہو چکی تھیں۔ ایسے اولوالعزم باپ کے زیر سایہ سلطان ٹیپوؒ کو جس قدر بھی اعلیٰ تربیت و تعلیم نصیب ہوتی کم تھی۔ بچپن سے ہی اسے فرانسیسی افسروں کے زیرِ سایہ فوجی تعلیم دلوائی گئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد وہ تقریباً ہر مہم میں باپ کا شریک و سہیم رہا، بلکہ اکثر لڑائیوں میں باپ کی نیابت کرتا رہا۔

حضرات! اس میں کلام نہیں کہ انگریزی امپیریلزم کو پچھلے دو سو سال میں ایشیا میں ان دونوں باپ بیٹوں سے زیادہ ہوش مند، دور اندیش اور طاقتور دشمن سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریزی روپیہ اور ڈپلومیسی اور مسلمانوں کی غداری اور قوم فروشی کی وجہ سے ان باپ بیٹوں کو اپنے عزائم میں کامیابی نہ ہوئی اور آزادیٔ وطن کے لئے ان کی جد و جہد کا نتیجہ سلطان ٹیپوؒ کی شہادت اور انگریزوں کی کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن ہ

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

سلطان ٹیپو رحؒ نے دِکھلا دیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں کی قوم ایسے شیر دِل بہادر پیدا کر سکتی ہے ۔ اس نے دِکھلا دیا کہ مسلمان اگر اپنے مذہب پر جان دے سکتا ہے تو اپنے وطن پر بھی ویسی ہی خوشی سے اپنی متاعِ زندگی قربان کر سکتا ہے ۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ ؎

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

سلطان ٹیپو رحؒ ایسے وقت میں پیدا ہوا جب کہ اسلامی اقتدار ہندوستان میں بتدریج فنا ہو رہا تھا اور ایک بیرونی قوم کا استیلا آہستہ آہستہ مستقل اور مکمل ہو رہا تھا ۔ سلطان حیدر علی کی دُور اندیش نگاہوں نے اُس وقت اس خطرے کو محسوس کر لیا جس کی تکمیل بعد میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی ۔ اور وُہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ تن مستعد ہو گیا اور اپنے مستعد اور قابل فرزند کو اس کے لئے تیار کیا ۔ باپ بیٹوں نے وطن کے سچّے پرستاروں کی طرح اپنے عزیز وطن کو اغیار کی غلامی سے چھڑانے کا عزم بالجزم کر لیا ۔ حیدر علی نے اس مقصد کی تکمیل میں اپنی تمام زندگی صرف کر دی اور اس کشاکشِ پیہم کو اپنے فرزند کے سپرد کر کے سفرِ آخرت

اختیار کیا۔ باپ کی جدوجہد کو بیٹے نے جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۷۸۲ء میں جب سلطان ٹیپو سریر آرائے مسند ہوا تو انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی انھوں نے اس جنگ کو اور شدت سے جاری کر دیا اور ؎

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

پر عمل کرتے ہوئے تخت یا تختہ کی بازی لگا دی۔ کیونکہ ایک بہادر انسان کے لئے دو ہی جگہیں ہیں یا تختِ آزادی اور عزت کی زندگی یا تختۂ مرگ اور شہادت یعنی عزت کی موت۔

انگریزوں نے بھی اپنے دشمن کو نیچا دکھانے کے لئے ہر قسم کے ہتھیار استعمال کئے اور جیسا کہ مسٹر ایسکوتھ وزیرِ اعظم انگلستان نے کہا تھا کہ "انگریز اتنا مردِ میدان نہیں جتنا کہ مردِ سیاست ہے۔ وہ لڑائی کو میدانِ جنگ میں جیتنے کی بجائے پسِ پردہ جیتنے میں مشاق ہے" انگریزی ڈپلومیسی کے متعلق جس نے سلطان ٹیپو اور انگریزوں کی مبازرت کو ایک داستانِ خدع و فریب اور ایک تاریخ عہد شکنی و وعدہ خلافی اور ایک المیۂ غداری و وطن فروشی بنا دیا۔ مدراس اور جنوبِ ہند میں ابھی تک بیشمار روایات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ایک تاریخی کمیشن مقرر کریں جو ان تمام واقعات کی چھان بین کر کے حقیقت کو افسانہ سے الگ کر دے اور دنیا کو دکھلا دے کہ سلطان ٹیپو رح کیونکر وطن فروشوں کی غداریوں کا شکار بنا۔ اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ قریباً سب کی سب انگریزوں

کے مہیا کردہ مواد پر مبنی ہیں اور مغربی اقوام سے اتنی انصاف پسندی کی توقع رکھنی کہ وہ اپنے کھلے ہوئے دشمن سے بھی انصاف کریں گے خیالِ عبث ہے۔
ایک عرصہ ہوا رسالۂ مخزن میں یلدرم نے بغداد سے سلطان شہیدؒ کا ایک مرثیہ لکھا تھا، جس میں اُس نے انگریزوں کے سلوک کو بے نقاب کیا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے ؎

بجا ہے اس کو جو بیداد گر کہیں انگریز
رقیب کو ستم آرا اگر کہیں انگریز

پھر وہ لکھتا ہے کہ انگریزوں کے دل میں اُس کی طرف سے غصہ اور کینہ اس لئے تھا کہ ؎

وہ جس کے نام سے ڈرتے تھے بچگانِ فرنگ
جلا نہ سامنے اُس کے کبھی چراغِ فرنگ

اُس نے انگریزوں سے بہت سی لڑائیاں لڑیں جن میں بعض میں وہ کامیاب رہا بعض میں ناکام مگر اس کی طاقت روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ بالآخر جب دانا دشمن اُسے لڑائی میں مغلوب کرنے میں ناکام رہا تو اُس نے سیاست سے اُسے نیچا دکھلانے کی تدابیر اختیار کیں۔ جنوبِ ہند میں مشہور ہے اور میں نے اسے بہت ثقہ راویوں سے سُنا ہے کہ جس طرح کرنل لارنس نے عربی وضع اختیار کر کے شام اور عرب میں عربوں کو ترکوں کے خلاف اُبھارا، اسی طرح ایک انگریز پیر بن کر حدودِ ریاست میں مقیم ہو گیا، اور کرنل لارنس کی داستان ریاست میسور میں بھی دہرائی گئی۔ وہ

مصنوعی پیر سُلطان کے خلاف لوگوں کو اُکساتا، اُس کے خلاف پروپیگنڈا کرتا اور لوگوں کو مالی امداد دے کر انھیں حکومتِ وقت سے برگشتہ کرتا، اور اُس نے اپنا جال اتنا پھیلایا کہ سُلطان کے بڑے بڑے فوجی افسر، وُزراء اور اُمرائے دربار بھی اس کے دامِ فریب میں پھنس گئے۔ اب سُلطان کے اندرُونی رازوں اور اس کی مہموں کے منصوبوں کا اس کے دُشمنوں کو علم ہونے لگا۔ اس کے فوجی افسر ظاہراً تو اس کی حمایت کا دَم بھرتے تھے مگر اندرُونی طور پر دشمن سے ساز باز رکھتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی۔ غدّاری ایسا جُرم ہے کہ جس کے خلاف کی جائے اُسے اس کا علم سب سے پیچھے ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا مدبّر اور دُور اندیش انسان بھی اس کا سدِّباب نہیں کر سکتا۔ ان ناموافق حالات کے باوجود بھی سلطان انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا اور برابر ہندوستان کو غیر مُلکی غلامی سے آزاد کرنے کی دُھن میں لگا رہا۔ اگر حالات نامساعدت نہ کرتے اور رفقاء غدّاری کے مرتکب نہ ہوتے تو آج شاید ہندوستان کی تاریخ ہی اور طرح پر لکھی جاتی مگر ہندوستان کی بد نصیبی کو کون مٹا سکتا تھا۔ اس کی قسمت میں تو اغیار کی غلامی لکھی تھی۔

حضرات! انگریزی تاریخ میں اسلامی سلطنتوں کے خلاف ایسی تدابیر اختیار کرنا ایک معمولی واقعہ ہو چکا ہے۔ عراق عرب میں (Miss Bill) نے یہی کام کیا اور مغربی تحریکِ آزادی کو (PALMER) پالمر نے اسی طرح مولوی بن کر کچلا مگر اس میں دُشمن کا کیا قصور جب خود مُسلمان ایمان فروشی

پر تُل جائیں تو خریدار پہ کیا الزام - از ماست کہ بر ماست۔

ہندوستان میں انگریزی سیاست کا نچوڑ کرنل سیلے نے ایک فقرے میں پیش کیا ہے۔ "DEVIDE and RULE" (مُلک کو مختلف گروہوں میں منقسم کر دو اور حکومت کرتے رہو۔) اسی طرح اُس وقت ہندوستان میں تین بہت بڑی طاقتور حکومتیں موجود تھیں۔ نظام۔ مرہٹے اور سُلطان ٹیپو رح۔ انگریز ان تینوں کا مقابلہ کرنا تو درکنار ان میں سے ایک کا بھی تنہا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے وُہ اِن تینوں کو آپس میں لڑا لڑا کر خوُد ہندوستان پر قابض ہوتے گئے اور حقیقت یہی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو ڈپلومیسی سے فتح کیا اور انگریزی حِکمتِ عملی نے خوُد ہندوستانیوں سے ہندوستان کو غلام بنایا۔ مِسٹر چرچل اور دوسرے ایسے کم سواد انگریزوں کا یہ دعوےٰ کہ ہم نے ہندوستان کو تلوار کے زور سے فتح کیا ہے، ایک مجذوبانہ بڑ سے زیادہ وقیع نہیں۔ سُلطان انگریزوں کی اس حکمتِ عملی کو خوُب سمجھتا تھا۔ اِس لئے اُس نے مرہٹوں اور نظام کو ملانے کی کوشِش کی۔ مگر نظام اور مرہٹوں کی حماقت اور نا عاقبت اندیشی اور غنیم کی شاطرانہ چالوں کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ ان سے مایُوس ہو کر اس نے سلطانِ روم اور نپولین اعظم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سُلطانِ رُوم نے تو خاموشی اختیار کی۔ نپولین اعظم بھی اس وقت مصر میں سکندرِ اعظم کی سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سلطان کے ساتھ اِتحاد کو اپنی ایشیائی سلطنت کی پہلی کڑی سمجھ کر پیغام بھیجا کہ مَیں مصر سے روم اور

ایران اور افغانستان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچ کر انگریزوں کا سر کچلنے میں تمھاری مدد کروں گا۔ مگر تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی کہ ہونے والا تو کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ سلطان کی تمام سکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ خائن عہدہ داروں کی غداری نے وہ کام کیا جو مضبوط اور قوی دشمن تلوار سے نہ کر سکتا تھا۔ سلطان کا اپنا ماموں محمّد صادق اور ہندو دیوان اس پیر کی کرامت سے انگریزوں کے ہاتھوں بک چکے تھے ؂

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

لڑائی کا پانسہ پلٹا اور فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی مشہور ہے کہ وہی پیر درپردہ لڑائیوں کی کمان کرتا تھا کہ فلاں مقام میں فلاں طرف سے حملہ کرو۔ میں نے فلاں افسر کو ساتھ ملا لیا ہے۔ سلطان فلاں طرف سے حملہ آور ہونا چاہتا ہے تم فلاں طرف سے ہجوم کرو۔ فلاں دستہ دراصل باغی ہے اس سے مت ڈرو۔ آگے بڑھو۔

میرے قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ غداری کی داستان کی تصویر کھینچ سکے اور میری زبان کو اتنا یارا کہاں کہ اس المیہ باب کی تشریح کر سکے۔ قصّہ مختصر ۱۷۹۹ء کے شروع میں انگریزوں نے خود سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ اس آخری لڑائی میں سلطان اور اس کے جاں نثاروں نے وہ وہ دادِ شجاعت دی کہ غنیم کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کی قوت قریباً فنا ہو گئی اور قریب تھا کہ وہ ناکام ہو کر صلح کی طرح ڈال دے کہ ۳ مئی کو غداروں نے

قلعہ کی فصیل میں شگاف کر دیا۔ واقعہ مشہور یہ ہے کہ اس پیر کے حکم سے دیوار کے ایک خاص مقام پر گولہ لگا کر اُسے اُڑایا گیا تھا اور پیر نے یہ کہا تھا کہ اس دیوار میں فلاں جگہ خزانہ مدفون ہے جو اُڑانے والے کو ملے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دیوان اور سپہ سالارِ فوج رشوت لے کر علانیہ انگریزوں سے جا ملے۔ سرنگا پٹم میں ایک مصوّر نے اس غدر کی ایک بہت بڑی تصویر دیوار پر کھینچ دی ہے جو آج بھی دیکھنے والوں کو خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ چنانچہ جو بھی زائر وہاں جاتا ہے، وہ جہاں سُلطان کے لئے دُعائے رحمت و مغفرت کرتا ہے، وہاں ان غدارانِ مُلک و ملّت پر لعنت کرتا ہے۔ قصۂ مختصر جب سُلطان نے یہ منظر دیکھا تو سمجھ لیا کہ اب کھیل ختم ہوا چاہتا ہے مگر اس وقت بھی اس نے وُہی کیا جو ایک سچے مومن اور بہادر باپ کے بہادر بیٹے کے شایانِ شان تھا۔ وہ اپنے چند جانثاروں کو لے کر شگاف میں سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آزادی کا یہ آخری سپاہی دونوں طرف بھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوتا تھا، اور جدھر گھوڑے کی عنان موڑتا تھا، دُشمنوں کے پرے کے پرے صاف کر دیتا تھا مگر گھر کے غدّاروں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور غنیم چکر کاٹ کر قلعہ کے دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ بالآخر ۴ مئی کو ہندوستان کی آزادی کا یہ آخری علمبردار شہادت کی آخری نیند سو کر اعلٰی علیّین میں جا ملا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا○

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سلطان کی شہادت سے ہندوستان کی آزادی کا خیال ایک خوابِ پریشان ہو کر رہ گیا۔ مگر اس لڑائی میں انگریزوں کی قوت بھی بہت کمزور ہو چکی تھی چنانچہ صُلح کانفرنس میں انگریزوں نے اس امر پر رضامندی ظاہر کی کہ سُلطان ٹیپوؒ کے بڑے بیٹے کو آدھی سلطنت دے کر انگریزوں کا باجگزار بنا دیا جائے۔ لیکن غدّار صادق نے کہا کہ "آتش را کشتن و اخگر گزاشتن دافعی را کشتن و بچہ اش را نگہداشتن کارِ خردمنداں نیست۔" انگریزوں کو اس ناصحِ مشفق کی بروقت نصیحت بہت بھائی۔ سُلطان کے فرزند نظر بند قید کر لئے گئے اور غدّاروں کو بیش قیمت جاگیریں مرحمت ہوئیں۔ اُس صادق کے بارے میں علّامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن

اور پھر فرمایا کہ دوزخ نے بھی ان کی ارواح خبیثہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی قبروں نے آہ و فغاں سے کروبیوں کے کان بہرے کر دیئے۔

حضرات! سلطان کی زندگی یوں تو تمام ہندوستانیوں کے لئے عموماً سر تا پا مرقعِ بصیرت و عبرت ہے مگر مُسلمانوں کے لئے اس میں خصوصیت سے بہت سی عبرتیں پنہاں ہیں۔ میں ان میں سے بعض کا مجمل سا ذکر کروں گا اور اس ضمن میں سلطان کے امتیازی اوصاف پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش

کروں گا۔

سُلطان کے نمایاں اوصاف میں سے جن کے لئے وہ اب تک جنوبِ ہند میں مشہور ہے سب سے نمایاں وصف اس کی حق پرستی اور معدلت گستری تھی۔ اس کے متعلق بہت سے واقعات اب تک زبان زدِ خاص و عام ہیں مثلاً اپنے بڑے بیٹے کو ایک کسان کے کھیت میں سے بلا اجازت سبزیاں لینے پر سزا دینا۔ قلعہ ڈنڈیگل پر حملہ کرتے وقت یہ حکم دینا کہ قلعہ کی پچھلی طرف سے گولہ باری نہ کی جائے۔ چونکہ اُس طرف راجہ کا مندر تھا۔ ہندو اور مسلمان میں بلا رُو رعایت انصاف کرنا۔ یہ نہیں کہ کالے کے لئے اور قانون اور گورے کے لئے اور قانون ہو۔ جب برہمن دیوان کی غدّاری عالم آشکارا ہو گئی تو اکثر مشیروں نے کہا کہ برہمنوں کی قوم ہی غدّار ہوتی ہے اور آپ نے انہیں بیش قرار وظائف دے رکھے ہیں۔ ان سب کو بیک قلم بند کر دینا چاہیئے تو سلطان نے کہا "مَیں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ قرآن حکیم کا حکم ہے: لَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ " صرف ظلم کرنے والوں پر زیادتی کرو" مَیں ظالم کے سوا کسی دُوسرے شخص پر جس کی شرکتِ جُرم ثابت نہیں کیونکر زیادتی کر سکتا ہوں۔"

حضرات! ایسا انصاف آپ کو اسلام ہی کی تاریخ میں مل سکتا ہے۔ مغرب کی تاریخ میں اس کی تلاش عبث ہے۔

دُوسرا نمایاں وصف سُلطان کا اور جس کی ہم مُسلمانوں کو خاص طور پر تقلید کرنے کی ضرورت ہے، ان کی عدیم المثال رواداری تھی۔ اِس ضمن میں اُوپر عرض کر آیا ہوں۔ سلطان کی داد و دہش صرف مُسلمانوں اور اِسلامی

اداروں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ہندو مُسلم یکساں اس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ چنانچہ توچناپلی کے مندر کے ساتھ اب تک ایک بہت بڑی جاگیر سلطان کی رواداری کی زندہ یادگار موجود ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تینجور، میسور، بنگلور اور ارکاٹ اور ڈنڈیگل میں سلطان کی عطا کردہ جاگیریں ہندو مندروں کے پاس اب تک موجود ہیں۔ اگر اس پہ بھی سلطان کو متعصّب کہا جائے تو معلوم نہیں ان بدنام کنندوں کے لیئے کون سا لقب تجویز ہونا چاہیئے۔ نہ صرف مندروں کو ہی سُلطان نے بیش قرار جاگیریں عطا کیں بلکہ خاندانی برہمنوں اور پروہتوں کو بھی معافیاں دیں اور وظائف عطا کیئے۔ اس سے بڑی رواداری کی مثال اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُس کا دیوان ایک ہندو برہمن تھا۔ اور گو اُس بدبخت نے سلطان سے وفا نہ کی مگر سُلطان نے ہمیشہ اس سے وفا ہی کی اور اُسے اس کے عہدے پر بحال رکھا۔ اگر آج ہم مسلمانوں میں سُلطان کی رواداری پیدا ہو جائے تو آج ہی فرقہ وارانہ تنازعات اور ہندو مُسلم کشیدگی کا حل پیدا ہو سکتا ہے۔

باوجودیکہ سلطان کو اپنی سترہ سالہ حکومت میں دشمنوں نے ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا مگر پھر بھی اس نے دکّن کو مہذّب بنانے میں جسقدر کامیابی حاصل کی، وہ تاریخ ہند میں اپنی مثال آپ ہے۔ سُلطان ٹیپو سے پہلے جنوبی ہند میں عورتیں عموماً نیم برہنہ رہا کرتی تھیں۔ صرف ایک تہ بند اُن کا لباس تھا۔ سینہ اور سر اور اوپر کا تمام دھڑ کھُلا رہتا تھا۔ لباس پہننا اسقدر معیُوب سمجھا جاتا تھا اور اب بھی مالابار کے بعض حصّوں میں جہاں سُلطان کا اثر نہ پہنچا تھا

اس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ہندو عورت کو قمیض پہنا دینا اس امر کے مترادف ہے کہ اسے جبراً مسلمان بنا لیا گیا ہے۔ ایسی وحشی اقوام کو سلطان نے متمدن بنایا۔ لباس پہننا اور کھانا کھانا سکھلایا۔ جا بجا مدارس قائم کئے اور تعلیم و ترغیب سے لوگوں کو لباس سے آشنا کیا۔ یہاں تک کہ اب بھی جنوبِ ہند کے ان علاقوں میں جہاں سلطان کا اثر و نفوذ تھا عورتوں کا لباس نہایت ساتر انہ ہے۔ پھر سلطان نے جنوبی ہند سے شوہروں کے تعدد کی رسم کو مٹایا اور بہت سی بد اخلاقیوں کو جو مذہب کے نام سے جنوبی ہند میں رائج تھیں اور اب بھی مالابار کے بعض حصوں میں رائج ہیں، روک دیا۔ وقت کی قلت تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔ سلطان نے سب سے پہلے مغربی آلاتِ حرب و ضرب کو ملک میں رواج دیا اور ہندوستانیوں کو اس نے مغربی طریق پر مسلح کر کے مغربی امپیریلزم کا سر کچلنا چاہا۔

میسور کی موجودہ تجارتی ترقی کی پہلی اینٹ سلطان نے ہی رکھی۔ اس نے فرانسیسی انجنیئروں سے کاویری میں آبپاشی کی خاطر بند بنوایا اور ریاست کی زرعی ترقی کی سکیم مکمل کروائی تھی اور اس کی ابتدا بھی ہو چکی تھی مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے مہلت نہ دی۔ اسی طرح اس نے اسلحہ سازی کا کارخانہ خود ریاست میں جاری کیا اور بہت سی صنعتیں اور حرفتیں رائج کیں، جو آج تک رائج ہیں اور انہی میں سے بعض بہت زیادہ ترقی کر چکی ہیں۔

سلطان کی حب الوطنی سے تو ہر شخص واقف ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی ہندوستان کو اغیار کی غلامی کی لعنت سے چھڑانے کے لئے وقف کر دی اور اسکی تمام مساعی کا محور یہی خیال رہا۔ اسی کے لئے وہ جیا اور اسی کے لئے وہ مرا۔

لیکن ایک امر سلطان کے متعلق خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ وہ بعض موجودہ محبّ وطن مسلمانوں کی طرح مذہب سے بیگانہ نہ تھا۔ آج کل مسلمانوں کی بدقسمتی سے اوّل تو ہم نیشنلسٹ خیالات کے مسلمان ہیں ہی کم اور جو ہیں ان میں سے اکثر مذہب سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور بعض تو ان میں سے مذہب کی مخالفت کرنے کو نیشنلزم کا لازمہ خیال کرتے ہیں۔ سلطان ٹیپو رح نے دُنیا کو یہ دِکھلا دیا کہ ایک مسلمان پکّا مسلمان ہو کر بھی بہترین محبِّ وطن ہو سکتا ہے اور اسلام اور حُبِّ وطن ایک ہی سینے میں جمع ہو سکتے ہیں اور ایک دُوسرے کی نقیض نہیں۔ سلطان نے اچھوتوں میں اشاعتِ اسلام کے ذریعے ان کا مرتبہ بلند کرنے کی اور اُنھیں برہمنوں کے دستِ تظلّم سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستِ میسور کے اکثر علاقوں میں مالابار کا تشدد مفقود ہے۔ سلطان کی حبِّ وطن کے متعلق علامہ اقبالؔ مرحوم اپنے شاہکار جاوید نامہ میں لکھتے ہیں کہ جب میں نے جنت میں شہیدِ مرحوم کی رُوح سے مُلاقات کی تو اُس نے مندرجۂ ذیل سوال کیا: ؎

باز تو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسُرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غمِ ما کُن غمِ اُو را قیاس — آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

اِن اشعار کے ایک ایک حرف میں شاعر نے سلطان شہید کی حُبِّ وطن کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے بعد شہید ہندیوں کی غدّاری اور کوتہ اندیشی پر اشک

افشانی کرتا ہے۔

حضرات! اب میں ایک نہایت ہی الم انگیز حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور در حقیقت سلطان کی داستانِ حیات میں سب سے بڑی عبرت وہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری تلخ نوائی کو معاف فرمائیں گے کیونکہ:

قرآن حکیم میں اشارہ ہوتا ہے کہ: وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (الانفال) "اور اس فتنے سے بچتے رہو۔ جو اگر اُٹھا تو اس کی زد انہی پر نہ پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں۔ بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔"

حضرات! حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فتنہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: تَسَلُّطُ الظَّلَمَةِ "یہ ظالم قوم کا تسلط ہے۔" اور پھر خود قرآن حکیم نے اسی سورۃ میں دو آیت بعد اس ظلم کی بھی تفسیر فرما دی کہ کون سی ایسی بد اعمالی ہے جس کا اِرتکاب اگر قوم کے بعض افراد کریں تو تمام قوم کی قوم محکوم بنا دی جاتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ "مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے خیانت کرو اور نہ یہ کہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔"

گویا ان دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ جب کسی قوم کے ایک یا چند مقتدر افراد قومی اور ملّی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کی بد اعمالی کی سزا میں تمام قوم کی قوم غلام اور محکوم بنا دی جاتی ہے۔ خیانتِ قومی ایسی آگ ہے جو دوست اور دشمن سب

کو جھلس دیتی ہے۔ غداری ایک ایسا اجتماعی جرم ہے جس کی تلافی قوم کے دوسرے افراد کا بہترین تدبر اور ایثار بھی نہیں کر سکتے بلکہ غداری ان سب ایثاروں اور قربانیوں کو غارت کر دیتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا (الآیۃ)

"اور رؤسا کا سب سے بڑا فسق ان کی غداری اور قومی خیانت ہے"

سلطان ٹیپو رح کی ناکامی کا ایک ہی سبب تھا اور وہ مسلمانوں کی غداری تھی۔ ہمیں شرم و خجالت سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی ہر تباہی کی تہ میں غداری اور قومی خیانت ہی رہی ہیں۔ اگر بغداد تباہ ہوا تو خلیفہ کے وزیرِ اعظم علقمی کی غداری سے، اگر اُندلس کی سلطنت برباد ہوئی تو مسلم علماء کی غداری سے، ٹرکی کی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو غدار و خائن خلفاء اور افسروں کی وجہ سے۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہی، غداری اور قوم فروشی کی ایک المناک داستان ہے اور اب بھی اگر دیکھا جائے تو اتنی ٹھوکریں کھانے کے باوجود ہماری اس خصوصیت میں کمی نہیں ہوتی۔ آج بھی ہمیں شرم و ندامت سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ قومی اور ملّی مفاد سے غداری مسلمانوں کا قومی کیرکٹر بن چکا ہے اور وہ ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے۔ مسلمانوں کے قومی اداروں کو لیجئے۔ میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور مجالس قانون ساز، غرض کسی پبلک شعبے کو لیجئے۔ آپ کو بہت کم مسلمان نظر آئیں گے جن میں فرض شناسی پائی جاتی ہو یا جنھیں ملکی و ملّی مفاد کا احساس

یا پاس ہو۔ ان میں سے اکثر نے ان تمام پبلک اور مذہبی اداروں کو ذاتی اغراض پوری کرنے یا مطلب برآری کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور باستثنائے معدودے چند سب اپنی معمولی سے معمولی غرض کے لئے بڑے سے بڑے قومی یا ملّی مفاد کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مذہبی ادارے بھی علیٰ ہذا القیاس چند مستثنیات کے علاوہ مُسلم اراکین و عمال کی شرمناک پارٹی بازی اور خودغرضیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ ہم میں اپنے گناہوں کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ ہم انفرادی اور مجموعی طور پر بے حِس ہو چکے ہیں۔ مگر اب حالات اُمید افزا ہیں اور مُسلم طلباء کی بیداری کے پیشِ نظر مسلمانوں کا مستقبل روشن نظر آرہا ہے۔ اس موقعے پر اپنے ان عزیز طالب علموں کو جنھوں نے سلطان ٹیپوؒ ایسی عظیم المرتبت ہستی کا پیغام دُنیا تک پہنچانے کا عزمِ صالح کر لیا ہے یہ کہنے کی جُرأت کروں گا کہ وہ اپنی قوم کی موجودہ پستی اور ذلت سے سبق حاصل کریں اور اپنے فرائض اور ذمّہ داریوں کو سمجھیں۔ اگر نوجوان اپنی اصلاح کر لیں تو مجھے یقین ہے کہ قوم کی تمام بیماریاں تندرستی اور صحت میں بدل جائیں گی اور اس کے علاج کے لئے دُور جانے کی ضرورت نہیں اگر ہم اپنے اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈال کر اپنے اعمال کا جائزہ لیں تو میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جائیگی۔ مجھے معاف فرمائیں، مَیں نے صاف صاف الفاظ میں اِس حقیقت کو بیان کیا ہے

رکھیو غالبؔ مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد میرے دِل میں سوا ہوتا ہے

ایک بات میں ضرور عرض کروں گا کہ غدّاری اور ملّت فروشی کے ملزم ہمیشہ زیادہ تر وہی لوگ رہے ہیں جن کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار رہی ہے اور آج بھی جس قدر غدّار آپ کو ملیں گے وہ زیادہ تر اسی طبقے میں سے ملیں گے جو اپنے تئیں مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا سمجھتا ہے یعنی اُمراء اور تعلیمیافتہ ۔ قصّہ مختصر اگر آپ مسلمانوں کی مساعی کا جائزہ لیں گے تو آپ کو میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی کہ غدّاری اور خیانت مسلمانوں کا قومی روگ بن چکی ہیں ۔ کیا اس کے بعد بھی آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ ہم خود ہی اپنی تباہی و بربادی کے ذمہ دار ہیں ۔ خدا تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے : ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ، اور بات یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے اُسے پھر کبھی نہیں بدلتا جب تک کہ خود اس قوم کے افراد اپنی حالت بدل نہ لیں ۔" یہاں بھی اپنی حالت بدل لینے سے مُراد قومی مفاد سے غدّاری و خیانت ہی ہے ۔ جب کسی قوم کے افراد اپنے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینا شروع کر دیتے ہیں تو وہ قومی غدّاری و خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ چنانچہ خدا تعالےٰ نے جس قدر انعامات سے اُمّتِ مرحومہ کو نوازا تھا وہ سب ایک ایک کر کے ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے ان سے چھن گئے : وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

پس اے بزرگان و عزیزانِ من ! اگر لگد کوب حوادث کا اس قدر شکار ہو کر حکومت ، سلطنت ، علم و دولت ، تجارت و ثروت سب کھو کر بھی ہماری

آنکھیں نہ کھُلیں اور ہم اپنے اس قومی روگ کا مداوا نہ سوچیں اور خود غرضی اور قوم و وطن فروشی میں مبتلا رہیں تو پھر ہمارا پنپنا محالات سے ہے۔ آج ہم اپنی ذِلّت و تباہی سے بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ بقول مرزا غالب رحمۃ اللہ علیہ ؎

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

سُلطان ٹیپوُ شہید رحمۃ اللہ علیہ کا حسرتناک انجام آپ کو پکار پکار کر بتلا رہا ہے، کہ خلوص کے بغیر مُسلمان کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے اس لئے اگر آپ بھی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر خلوُص و عزم بلند پیدا کیجئے اور نفاق سے، جو غدّاری اور قوم فروشی کا اِسلامی نام ہے، اپنے سینوں کو پاک کیجئے۔ ورنہ آپ کی سب مساعی اکارت جائیں گی۔ یہی سلطان کا پیام ہے اور اگر ہمیں اپنی اس کمزوری کا صحیح احساس پیدا ہو جائے اور اصلاح کا جذبہ ہمیں بے قرار کر دے تو مَیں سمجھوں گا کہ سُلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قربانی اکارت نہ گئی۔

رہے گا کوئی تو تیغِ ستم کی یادگاروں میں
مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں

(انگلستان میں ہندوستان کی غریب الوطن یادگاریں اور انکی سرگزشت)

(پروفیسر حافظ محمود خان صاحب شیرانی لیکچرار پنجاب یونیورسٹی - لاہور)

پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب کا یہ مضمون مخزن بابت ماہ جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے انڈین سیکشن کی بہت سی تاریخی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ مضمون نہایت دلچسپ ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس مضمون میں سلطان شہید رح کی بعض نایاب چیزوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ خصوصاً سلطان شہید رح کا ساز۔ اِسلئے ہم مضمون کا وہ حصہ جس کا تعلق سلطان شہید رح سے

ہے شائع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس سے قارئین کی معلومات میں کافی اضافہ ہوگا۔

عبداللہ بٹ

لندن کا وکٹوریہ البرٹ میوزیم بارہ ایکڑ زمین پر واقع ہے۔ یہ عمارت اوّلاً ۱۸۵۰ء کی نمائش کے لئے تیار ہوئی تھی، جس پر دولتِ برطانیہ نے ساٹھ ہزار پونڈ یعنی نو لاکھ روپے صرف کئے۔ ۱۸۵۵ء میں اس پر ایک چوبی اور آہنی عمارت مستزاد ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں اس کا نام ساؤتھ کینزنگٹن میوزیم رکھا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں اس عمارت میں اور اصلاح ہوئی اور اس اصلاح شدہ عمارت کا نام تاج دار بیوی اور بے تاج شوہر کی یادگار میں وکٹوریہ البرٹ میوزیم رکھا گیا۔

اس عمارت میں قدیم و جدید فنون و علم کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو دُنیا کی ممتاز قوموں کے تمدن اور تمدن کی ترقّی کی تاریخ ظاہر کر رہا ہے۔ مشرقی اقوام کا تمدن ایک علیٰحدہ عمارت میں دکھایا گیا ہے جہاں ہندی، ایرانی، شامی، عربی، ترکی، چینی اور جاپانی صنائع کے علیٰحدہ علیٰحدہ کمرے موجود ہیں۔ اس عمارت کے تقریباً تیس کمرے ہندوستان کی صنعت و حرفت سے پُر ہیں۔ باقی کمرے ممالکِ متذکرہ بالا کی مصنوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میَں اس وقت میوزیم کے دُوسرے حِصّوں سے بحث نہیں کرتا۔ صرف اِسی حصّہ عمارت کی بابت گفتگو کرتا ہوں جس سے ہندوستان کو تعلق ہے۔

میوزیم کے اس حِصّے کی ابتداء ایسٹ انڈیا کمپنی سے علاقہ رکھتی ہے۔ کمپنی کی وفات پر اس کا اثاثہ انڈیا آفس کو پہنچا۔ جس میں انڈین میوزیم بھی شامل تھا۔ ۱۸۸۰ء

میں یہ میوزیم ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم سے ملحق کر دیا گیا۔ اس عمارت کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے " انڈین سیکشن "۔ غیر قوم ان سے متاثر ہو یا نہ ہو لیکن ایک ہندوستانی کو یہ الفاظ مغموم یا مغرور ضرور کریں گے۔ دروازے پر ایک گورا کالی وردی میں ٹہلتا نظر آئے گا۔ اگر آپ پگڑی باندھے ہوئے ہیں تو " انڈین پرنس " سمجھ کر سلامی دے گا اور آپ کے لئے راستہ چھوڑ دے گا۔ دروازے میں گھستے ہی جے پور کے ہوا محل نظر آئیں گے جن کی نقل پیتل کی ہے۔ اب آپ ایک چوبی چھت دیکھیں گے جو کہ چین کے کسی مندر کی ہے اور راجہ رام چندر جی کی شادی کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

سلطان ٹیپو کی یہاں کئی یادگاریں ہیں۔ کوئی چیز اس قدر عبرت انگیز نہیں ہو گی جس قدر یہ چیزیں، اور جب ہم اس کے مقصدِ زندگی کا خیال بھی ذہن میں لاتے ہیں تو یہ چیزیں اور بھی دِل کو گداز کرتی ہیں۔ یوں تو اس کا مزار ہندوستان میں ہے لیکن یہ چیزیں بھی مزار سے کم نہیں۔ یا یہ کہیئے وہاں ایک مزار ہے اور یہاں کئی مزار۔ اس مزار میں اس کا جسم دفن ہے اور ان مزاروں میں وہ چیزیں دفن ہیں جو زندگی میں اس کا جزوِ بدن رہ چکی ہیں۔ اصلی مزار اس قدر پائدار نہ ہوگا جس قدر یہ مزار پائدار ہیں ؎

رہے گا کوئی تو تیغِ ستم کے یادگاروں میں
مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

ایک صندوق میں اس کی شمشیر ہے، میان گم ہے۔ یہ تلوار ایرانی

ساخت کی ہے۔ بالکل ہلالی وضع ہے، قبضہ پر سونا چڑھا ہُوا ہے جس پر دمشقی کام ہے جو ہندی ساخت کی تلواروں میں بہت نایاب ہے۔ قبضہ اور تلوار دونوں پُرانے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ قبضہ کا سونا اور بیل بُوٹے دونوں مِٹ چلے ہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ تلوار ٹیپُو رحمۃ کے زمانے سے بھی پُرانی ہے۔ تلوار پر سنہری حرُوف میں لکھا ہوا ہے "ٹیپُو سُلطان" یہ کام نیا ہے اور قبضے کے کام سے بعد کا۔ یہ وُہ تلوار ہے جس کے زور سے سلطان ٹیپُو رحمۃ ہندوستان کے وُہ مُردہ قوٰی زندہ کرنا چاہتا تھا جن کو حکمرانی کہا جا سکتا ہے اور کیا عجب ہے یہی تلوار اس وقت اس کے ہاتھ میں ہو جبکہ وُہ سرنگا پٹم کے دروازے پر زخموں سے چُور نقشِ بے جان ہو کر گرا۔ میان کا گم ہونا ہمارے خیال کی تائید کر رہا ہے اور یہ نفی بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے اسلحہ خانے سے انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگی۔

ایک صندوق میں ٹیپُو کا آہنی خود ہے جس کے کناروں پہ سونے کی بیل بھری ہے۔ لوہے کا بینی پناہ ہے جس کو کنڈے کے ذریعے سے اتارا چڑھایا جا سکتا ہے۔ بینی پناہ کے دونوں بازوؤں میں دو نلیاں ہیں جن میں دو زرتار طرّے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ خود کے وسط میں ایک شاخ نکلی ہے۔ دامن پہ لوہے کی چادر جھالر کی طرح لٹک رہی ہے جس کو کڑیوں کے ذریعے سے خود کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ یہ چادر چہرے کی طرف چار انگل چوڑی ہے لیکن پُشت اور بازوؤں میں اسقدر چوڑی ہے کہ

گردن اور کندھوں کی حفاظت بخوبی ہو سکے۔ یہ خود ایرانی خودوں کی قطع سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ کام اس پر اس قدر عمدہ اور خوشنما نہیں کہ اسلامی خودوں میں بہترین کہلایا جا سکے۔ اس میوزیم میں اس سے اچھے اچھے خود ہیں لیکن ان کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ برٹش میوزیم میں شاہ عباس صفوی کا ایک خود ہے جو تمام خودوں سے بہتر اور اعلےٰ ہے۔

ایک مقام پر ٹیپو کا ٹوپ ہے۔ چمڑے کے استر پر ایک ایک انچ موٹی روئی کی تہ جمی ہوئی ہے۔ جس پر چھینٹ کا استر ہے اس پر سبز اطلس منڈھی ہے۔ سبز مخمل کی آدھ آدھ انگل چوڑی گوٹ ہے۔ پہننے پر یہ ٹوپ آدھی پیشانی ڈھانک لیتا ہے۔ گردن اور کندھوں کی طرف اس قدر نیچا ہے کہ گردن اور کندھوں کا بچاؤ ہو سکے۔ ٹوپ کے اندر فارسی میں کچھ تحریر ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ انگریزی میں اس قدر بیان کیا گیا ہے کہ یہ چیز زمزم کے مقدس پانی میں دھوئی گئی ہے اِس لئے کوئی حربہ اثر نہیں کرے گا۔ اِس عقیدے پر آج دُنیا ہنسے گی لیکن یہ یاد رہے کہ ٹیپو رح کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ وُہ زمانہ ایسا تھا کہ مُسلمان مذہب کی روشنی میں آنکھ کھولتے تھے اور اسی روشنی میں آنکھ بند کرتے تھے۔

ایک خانے میں ٹیپو رح کے دستانے ہیں۔ کہنی سے لے کر کلائی کے قریب تک یک طرفی حفاظت کا کام دیتے ہیں۔ کلائی پر کفوں کی طرح دوہرے ہیں۔ دو طرفہ حفاظت مقصود ہے جو کڑیوں کے ذریعے کھولے

اور بند کئے جا سکتے ہیں - اندر کی طرف تسمے اور گھنڈیاں ہیں جن کو پہننے پر کس دیا جاتا تھا - ان دستانوں پر سونے کا کام بنا ہوا ہے اور دمشقی بیل بوٹے ہیں -

اسی خانے میں ٹیپو کا سینہ بند ہے جس سے سینے اور پشت کی حفاظت مقصود ہے ، سینے کی طرف سے کھلا ہوا ہے اور بٹنوں کی بجائے کڑیاں لگی ہوئی ہیں جو ریشمی تسمے کے ذریعے کس دی جاتی ہوں گی - یہ سینہ بند بھی ٹوپ کی طرح ایک انچ موٹا ہے - اندر شاید چمڑا ہو - باہر کا استر سبز اطلس کا ہے جو پرزے پرزے ہو رہا ہے -

ٹیپو کا زین پوش --- یہ زین پوش قرمزی رنگ کا ہے - چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور چار فٹ ساڑھے آٹھ انچ چوڑا ہے - مخمل پر نہایت اعلےٰ درجہ کا زری کا کام ہوا ہے - یہ کام کسی اُستاد کے ہاتھ کا ہے تمام میوزیم میں اِس قدر صفائی کا نمونہ نہیں مِلتا - بیل بوٹے اپنی وضع میں اعلےٰ درجے کے ہیں اور جو نزاکت اور ستھرا پن کاریگر نے اس کام میں دکھایا ہے وہ لاجواب ہے - میوزیم نے چالیس پونڈ میں اس زین پوش کو خریدا ہے -

ایک چھوٹی سی پیتل کی توپ ہے جو ڈیڑھ گز لمبی ہے - توپ کے مُنہ پر گینڈے کی شکل بنی ہوئی ہے - یہ توپ سرنگا پٹم سے انگریزوں کے ہاتھ لگی - یہ توپ بھی سلطان ممدوح کی یادگار ہے -

یہاں عجیب قسم کا ساز ہے جو اپنی وضع میں اکیلا ہے - اس آرگن

کی یہ شکل ہے کہ لکڑی کے ڈیڑھ گز لمبے اور پون گز چوڑے تختے پر ایک انگریز چت لیٹا ہے جس پر ایک شیر سوار ہے۔ شیر کی دونوں داڑھیں انگریز کی گردن میں گڑی ہوئی ہیں۔ اگلے پنجے سینہ میں پیوست ہیں۔ شیر کا جسم اندر سے خالی ہے۔ اس خالی مقام میں ایک کل رکھی ہوئی ہے۔ اس کل میں ہارمونیم کی طرح سے برابر قطار میں اٹھارہ پردے ہیں۔ پردوں میں تین تین انگل اونچی، انگل انگل موٹی اٹھارہ نلیاں دوہری قطار میں ہیں جن پر تانبے کا دو انچ چوڑا تار پردوں کے متوازی لگایا گیا ہے۔ پردوں کے اختتام پر ایک دندانے دار چکر ہے جس کا تعلق ایک آہنی تار کے ذریعے باہر کے دستے سے ہے۔ دستہ شیر کے بازو پر باہر کی طرف بنا ہوا ہے اور اس کا اثر نلیوں اور پردوں پر پہنچتا ہے۔ شیر کی دُم پر دو مروڑیاں ہیں جن پر مروڑنے سے اندر کا تار گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ شیر کا جسم تختیوں کے ذریعے ڈھکا ہوا ہے۔ تختیاں اس قسم کی ہیں کہ ان کو کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے یہ ساز سلطان ٹیپو کی تفریح طبع کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ عیار موجد نے یہ کمال دکھایا ہے کہ اپنی اختراع کے ساتھ سلطان کی اداشناسی اور مزاج دانی کو بھی نباہ دیا ہے۔ یہ آلہ ہم کہہ سکتے ہیں کسی ہندوستانی کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ اس کو یورپین مصنوعات سے کوئی مشابہت نہیں پردوں کا ڈھنگ ممکن ہے ہارمونیم کے پردوں سے اڑایا گیا ہو۔ اگر یہ ممکن ہے کہ اس وقت ہارمونیم ہندوستان میں رواج پا گیا تھا۔ ہارمونیم

کے پردے طویل مرتّج ہوتے ہیں لیکن یہ پردے بالکل محدود ہیں۔ پھر اٹھارہ پردوں کا ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سوال ہم ماہرینِ فنِ موسیقی کے لئے چھوڑتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایرانی موسیقی کے دوازدہ پردہ اور شش شش آہنگ کا مجموعہ ہو۔ سلطان ٹیپو کی ایرانی تمدّن سے محبّت اس کے ہر مذاق سے پائی جاتی ہے۔

سُلطانِ شہید

(علّامہ اقبال مرحوم)

آتشے در دِل دگر بر کردہ ام
داستانے از دکن آوردہ ام

در کنارم خنجرِ آئینہ فام
می کشم اورا بتدریج از نیام

نکتۂ گویم ز سُلطانِ شہید
زانکہ ترسم تلخ گردد روزِ عید

پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او
تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست

سُلطان کے ان خطوط سے صاف
ظاہر ہے کہ سُلطان ہندوؤں کے
ساتھ ہر قسم کی رواداری کا برتاؤ
کرتا تھا اور ان کے رشیوں کو انتہائی
عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا
تھا۔

ان تحریروں کی روشنی میں ٹیپوؔ پر
تعصب کا الزام لگانا بہت بڑا
اخلاقی جرم ہے۔

سُلطان حیدر علی اُور سُلطان ٹیپوؒ

ایک تحقیقی مقالہ کا انگریزی سے ترجمہ

ابھی حال ہی سرنگری کے ایچ۔ ایچ جگت گرو سری شنکر اچاریہ کے مٹھ میں ۲۹ تحریریں ملی ہیں جو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہدِ حکومت کے متعلق ہیں اور جن کی اہمیت تاریخی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ میسور کے ان حکمرانوں کے متعلق نئے واقعات کا انکشاف کرتی ہیں جن کو اکثر مؤرخوں نے صحیح واقعات کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تاریک رنگوں میں پیش کیا ہے۔

ان تحریروں میں سے تین تو "اسنا" یا تانبے کی تختیوں کے عطیات ہیں۔ دوسری تحریریں حیدر اور ٹیپو سلطان رح کے خطوط ہیں جو انھوں نے جگت گرو سوامی کے نام سرنگری بھیجے تھے۔ ان خطوط پر تمام تاریخیں سنہ مولودی میں ہیں اور ان کے سروں پر گول مہریں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا کاغذ سرخ رنگ کا ہے۔ ان خطوط کی تاریخیں تقریباً ۱۷۹۰ء سے ۱۷۹۸ء تک ہیں۔ ان خطوط کے مضامین ان دونوں مسلمان حکمرانوں اور میسور کی ہندو رعایا کے ان تعلقات کی اصلیت کا صحیح خاکہ کھینچ دیتے ہیں جو آج سے ڈیڑھ سو برس قبل ان میں قائم تھے۔

اسوقت تک ہندوستان جدید کے اکثر مؤرخوں کی یہ رائے رہی ہے کہ حیدر اور ٹیپو رح کو ہندوؤں سے نفرت تھی اور انھوں نے ہندوؤں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں لیکن ان دریافت شدہ تحریروں کی روشنی میں اس قسم کا نظریہ بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔

سوامی سے دعا کی خواہش

ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر اور ٹیپو رح کی سرنگری کے ہندو گرو سے مسلسل خط و کتابت رہتی تھی۔ باپ بیٹے دونوں نے ہمیشہ اپنے خطوط میں گرو کا بہت احترام ظاہر کیا ہے اور ان سے اپنے دشمنوں کی بربادی کے لئے دعا کرنے کی استدعا کی ہے۔ ٹیپو رح کے

ایک خط کا مندرجہ ذیل ترجمہ جو اس نے ۱۷۹۱ء میں سوامی کو لکھا تھا مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کے لئے کافی ہوگا:

"سچدانند بھارتی سوامی سرمیت پرمہیش
وغیرہ کو بادشاہ ٹیپو سلطان کا سلام!

ہم آج کل مخالف افواج کی سرکوبی میں جنھوں نے ہمارے ملک پر حملہ کیا ہے اور ہماری رعایا کو لوٹ رہی ہیں، مصروف ہیں۔ آپ ایک مقدس ہستی اور سادھو ہیں۔ چوں کہ عوام کی بھلائی کا خیال رکھنا آپ کا فرض ہے اس لئے ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ آپ مع مٹھ کے دیگر برہمنوں کے خدا سے دعا کریں کہ تمام دشمن شکست کھا کر بھاگ جائیں تاکہ ہمارے ملک کی تمام رعایا خوشی اور چین سے رہے اور ہمارے اوپر آپ اپنی برکتیں رکھیں۔"

سلطان ٹیپو کے دوسرے خطوط میں جو گرو کے نام ہیں ایک بے حد دلچسپ واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ۱۷۹۱ء کے اختتام کے قریب باغی مرہٹہ سواروں کے ایک چھوٹے سے دستے نے سوارم بھاؤ کی سرکردگی میں سرنگری مٹھ پر حملہ کیا۔ مٹھ کی تمام دولت لوٹ لی۔ بہت سے برہمنوں کو مار ڈالا اور زخمی کیا اور دیوی شاردا کی مورتی کو مع تمام مال غنیمت لے کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد سوامی نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے سرنگری کو چھوڑ دیا اور پاس کے

ایک گاؤں کو کالا میں جا بسے اور ٹیپو سلطان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان نے جو اس ہندو سادھو کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے میں بہت اعلیٰ واقع ہوا تھا، ضروری امداد مہیا کر دی اور سوامی کو لکھا:

"وہ لوگ جنھوں نے آپ جیسی مقدس ہستی کو تکلیف پہنچائی ہے یقیناً بہت جلد اپنی اس حرکت اور کرتوت کا مزا چکھیں گے۔ وہ جرم تو ہنستے ہوئے کرتے ہیں لیکن روتے ہوئے سزا پائیں گے۔ گرووں سے مکاری کرنے کا نتیجہ بے شک خاندان کی تباہی ہوگا۔ اس خط کے ساتھ ایک حکم نامہ بنام آصف نگر بھیجا جاتا ہے جس میں اس کو حکم دیا گیا ہے کہ ہماری حکومت کی طرف سے دیوی شاردا کے چڑھاوے اور دوسری ضروری اشیاء کے لئے دو سو "رہتی" نقد اور دو سو "رہتی" کی جنس دے دے۔ آپ ضروری اشیاء انام گاؤں سے بھی لے سکتے ہیں اور اسطرح آپ دیوی کو چڑھاوا دیں گے۔ اور برہمنوں کو بھوجن کرائیں گے۔ بعد میں مہربانی فرما کر ہمارے اقبال کی ترقی اور ہمارے دشمنوں کی بربادی کی دعا کیجئے۔"

ہمیں ان خطوط میں سے اکثر کے ذریعے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ٹیپو نے فیاضانہ مدد کے علاوہ ۱۷۹۳ء میں ان نقصانات کے مطالبہ کے لئے مرہٹوں کے خلاف ایک فوج بھی بھیجی تھی۔ سلطان کو سوامی کا اتنا خیال تھا کہ اس نے سوامی کو ہندوستان کے تمام مقدس

تیرتھوں کی یاترا بھی کرائی اور ان کی ہر طرح مدد کی۔

غرض کہ ان تحریروں کی روشنی میں حیدر اور ٹیپو پر کوئی ہندو بھی متعصب ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان خطوط کی بنا پر کہے کہ یہ مسلمان حکمران ہندو مذہب کے ساتھ ہر قسم کی رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور انھوں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو اس کی ترقی میں حائل ہوتا تو یہ بالکل بجا ہوگا۔

سرنگاپٹم

(مولانا ظفر علی خان)

اے سرنگاپٹم ! اے گنجِ شہیدانِ کرام
آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود

تیری آنکھوں میں ہیں اپنوں کا عروج اور زوال
تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ہبوط اور صعود

کام میں لا نہ سکی تھی جسے خاکِ دہلی
تیرے ذروں نے بچھا دی وہ حجازی بارود

کشورِ ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبود

سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر
مایۂ ناز تھا ملت کے لئے جس کا وجود

قوتِ بازوئے اسلام تھی اسکی صولت
اس کی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود

کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

اس کے اٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا صعود

آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا
جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود

شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود!

دلِ حسرت زدہ میرا بھی گیا ساتھ جب آج
اس کے مرقد پہ گئے پاس و تمنا کے وفود

پھر گئی آنکھ میں فردوسِ بریں کی تصویر
ظلِّ ممدود میں تھا جلوۂ سدرہ مخضود

اس کی دہلیز سے لپٹی ہوئی تھی رحمتِ حق
چومتے تھے جسے جھک جھک کے ملائک کے وجود

آئی گنبد سے ندا اے کہ تری پیشانی
رات دن درگہِ داور پہ رہی وقفِ سجود

بر سرِ تربت من چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

میں نے کی عرض کہ اے فطرتِ آزاد کی روح
توڑ دی جس نے سکھائی ہیں غلامی کی قیود

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

ٹیپو سلطان

رزم و پیکار کی جبری مصروفیتوں سے جب فارغ
ہو کر بزم کی طرف آتا
تو

کتابوں کے کاغذی دوست ہی اس کے بہترین
ندیم و ہم نشین ثابت ہوتے تھے یہ جلیل القدر انسان
ملت کی کتابِ نظم کے اوراقِ پریشان
کی شیرازہ بندی کا داعیۂ عظمےٰ
لے کر آیا تھا۔

ٹیپو سلطان کا کتب خانہ

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔اے ڈی لٹ
(لیکچرار پنجاب یونیورسٹی، اورنٹیل کالج - لاہور)

اگرچہ اسلامی سلطنتیں آج ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں لیکن مقامِ صد مسرت ہے کہ ان پرانی بادشاہتوں کے شاندار کارنامے کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ہمارے دلوں کو گرمانے کے لئے مل جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ "انصاف پسند یورپ" نے ہماری تصویر کے جو خدوخال نمایاں کئے ہیں ان سے سوائے اسکے کچھ ظاہر نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں تسلط، تغلب اور جبر و اقتدار کے بغیر کوئی علمی اور تعمیری کام نہیں کیا۔ لیکن

جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہو ہی جاتا ہے کہ جھوٹ کے ان پردوں کے نیچے سے سچ اور حقیقت اسطرح نکل آتی ہے جس طرح زمین میں مدفون دانے سے پودا نکل آتا ہے یا جس طرح انگور کی سبز بیل سے پتے اور خوشے ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔

مسلمان بادشاہوں نے اپنے زمانے میں نہ صرف یہ کہ علم اور تعلیم کی اشاعت کا بندوبست کیا بلکہ بیشتر حکمران خود بھی بہت بڑے عالم اور صاحب فضیلت ہوا کرتے تھے۔ ان کے کتب خانے، ان کا شوقِ مطالعہ، ان کی علمی قدردانی، کتابوں کی فراہمی کا ذوق، کتب خانوں کی آرائش کا اہتمام، جلدبندی، نقش کاری، اور تذہیب کی کوششیں، ان کی اعلےٰ درجے کی شائستگی اور حسنِ ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ اندلس میں الحکم ثانی کا کتب خانہ کم و بیش لاکھ ڈیڑھ لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے بقول ڈوزیپر و دیگر مورخین، تقریباً ہر ایک پر الحکم کی یادداشتیں اور نوٹ موجود ہیں۔ بایسنغر مرزا گورگانی کے متعلق پروفیسر براؤن فرماتے ہیں کہ "اس کا شوقِ کتب یورپ کے بڑے سے بڑے عاشقانِ کتاب سے بڑھا ہوا تھا۔" اکبری اور جہانگیری کتب خانوں کی بچی کھچی کتابیں آج بھی یورپ کی لائبریریوں کے لئے باعثِ صد ہزار زینت ہیں۔ اور ان لائبریریوں کی فراہمی اور تزئین کے لئے جو اہتمامات ہوا کرتے تھے ان کا حال تزک، بادشاہنامہ اور عملِ صالح ایسی کتابوں سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

سلطان شہید ٹیپو رح اور ان کے نام آور باپ حیدر علی کا نام بھی بلا خوفِ تردید علم پسند اور کتاب پرست بادشاہوں کی برگزیدہ صف میں شمار ہو سکتا

ہے۔ مؤرخینِ فرنگ کے نزدیک ٹیپو متعصّب، ظالم، خونخوار اور خدا جانے کیا کیا تھا لیکن کون نہیں جانتا کہ اسلامی جاہ و جلال کے اس آخری دور میں یہ جلیل القدر سُلطان بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کرنے اور ملّت کی کتابِ نظم کے اوراقِ پریشان کی شیرازہ بندی کرنے کا داعیۂ عظمےٰ لے کر آیا تھا۔ پس ان حالات میں فرنگی سیاست کا تقاضا سوائے اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ ٹیپو سُلطان کو بھی اس صف میں شامل کر دیا جاتا جس میں اس سے پہلے محمد تغلق، اورنگ زیب عالمگیر اور بے شمار اور نامور ہستیاں شامل کر دی گئی تھیں۔

سلطان شہید کی علم پسندی اور علم پروری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اُنھوں نے جامع الامور کے نام سے سرنگاپٹم میں ایک یونیورسٹی قائم کی تھی جس میں علاوہ دینی علوم کے دُنیادی فنونِ نافعہ کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ سلطان مصنّف تھا اور مصنّفین کا قدردان بھی۔ فنِ انشاء، طب اور مذہبیات میں استعدادِ وافر رکھتا تھا۔ کرنل کرک پیٹرک اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ اس قدر مختصر اور پُرمعنی ہوتی کہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے تھے۔ تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سُلطان کے قلم سے نکلی ہے۔"

اس کے علاوہ بقول سٹوارٹ صاحب کے ۴۵ سے زیادہ کتابیں سلطان کی ذاتی نگرانی میں لکھی گئیں، جو زیادہ تر آئین و قوانینِ سلطنت سے متعلق تھیں۔ سُلطان شہید نے ایک لائبریری بھی قائم کی تھی جس میں کم و بیش ۲ ہزار

نسخے قلمی کتابوں کے موجود تھے ان میں عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں۔ ان میں بیشتر عمدہ خط میں تھیں لیکن بعض کی حالت اچھی نہ تھی۔ "سلطنتِ خداداد" کا مصنف لکھتا ہے:

"یہ کتب خانہ سوائے چند کتب کے سارے کا سارا ولایت
بھیج دیا گیا۔ یہ چند کتب کلکتہ کو بھی بھیجی گئیں"

۱۷۹۹ء میں جب سرنگا پٹم پر انگریزی تسلط ہوا تو یہ کتب خانہ چھ سال تک کس مپرسی کی حالت میں رہا۔ اس کے متعلق میجر سٹوارٹ نے ان مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی جو ۱۸۰۹ء میں بمقام کیمبرج چھپ کر شائع ہوئی۔ یہی سٹوارٹ صاحب لکھتے ہیں:

"کتب خانہ کی ترتیب و تہذیب کے لئے ایک مہتمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ سلطان کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق ہیں۔ سلطان نے اپنے فرامین کے کئی مجموعے تیار کرائے تھے، جو اس وقت بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ سلطان جو کتاب مطالعہ کر چکتا تھا، اس پر مُہر لگا دیتا تھا۔ اس طرح اکثر کتابوں میں مُہریں ثبت تھیں"۔

انہی سٹوارٹ صاحب کا بیان ہے کہ یہ کتب خانہ دراصل شاہانِ بیجاپور اور گولکنڈہ کے کتب خانوں اور نواب نصیر الدولہ عبدالوہاب خاں کی لائبریری کے آثارِ باقیہ پر مشتمل تھا۔ جو کتابیں سلطان کے کتب خانہ میں آکر از سرِ نو مجلد ہوئیں۔

ان پر "اللہ" "محمدؐ" "فاطمہؓ" "حسنؓ" "حسینؓ" کے نام کندہ ہیں۔ اسیطرح خلفائے اربعہ کے نام جلد کے چار کونوں پر منقش ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں، جن پر لفظ "ٹیپو سلطان" بھی منقش ہے۔

سٹوارٹ صاحب نے جو فہرست قلمیات مرتب کی ہے، اس میں علاوہ اصل کتب خانہ کے وُہ کتابیں بھی مندرج ہیں جو میجر ملکم اور مسٹر ایلیبٹ کے کتب خانوں میں موجود تھیں اور جن کا تعلّق دراصل سلطان کے کتب خانہ سے تھا۔

اس فہرست کے شروع میں سلطان حیدر علی اور سُلطان ٹیپوُ کے مفصل حالاتِ زندگی بھی لکھے گئے ہیں اور صفحہ ۹۴ پر بعض ایسی کتابوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جن میں ان دونوں سلطانِ عظام کے حالات مل سکتے ہیں۔

موجودہ مقصد کے اعتبار سے یہ موزوں معلوم نہیں ہوتا کہ اس موقع پر ٹیپوُ سلطان کی لائبریری کے نوادر پر بحث کی جائے۔ اس کے لئے زیادہ شوق رکھنے والوں کو سٹوارٹ صاحب کی فہرست کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جس میں اگرچہ اغلاط تو کافی تعداد میں موجود ہیں پھر بھی کتابوں کی کیفیت کا سرسری سا اندازہ ہو جاتا ہے میرے خیال میں بلحاظِ نوادر اس کتب خانہ کو کوئی خاص اہمیت حاصِل نہیں۔ لیکن یہ امر کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان کے ضوابط و آئین اور دکنی اور اردو لٹریچر کے قدیم آثار کے متعلق اس لائبریری میں اچھا خاصا ذخیرہ موجُود ہے۔

اس مقالہ کا مقصد جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہوگا یہ نہیں کہ اس میں کتب خانہ کی قدر و قیمت پر بحث کی جائے بلکہ شاہانِ اسلام کے علمی ذوق کے متعلق قارئینِ کرام کو ایک جھلک دکھانی پیشِ نظر ہے۔ دُنیا میں جنگ و پیکار صرف قدیم زمانے میں ہی نہیں (بلکہ آج بھی) شاہی اور ملکداری کے لئے لازمۂ لاینفک ہے اور اس ضمن میں بعض اوقات تعدّی اور اعتدال سے تجاوز کی مثالیں بھی قدرۃً مل جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں جو چیز دیکھنی چاہیئے وُہ یہ ہے کہ ہمارے سلاطین و اُمراء رزم و پیکار کی جبری مصروفیتوں سے جب فارغ ہو کر بزم کی طرف آتے تھے تو وہاں کتابوں کے کاغذی دوست ہی ان کے بہترین ندیم و ہمنشین ثابت ہوتے تھے ::

نپولین اور ٹیپو رح

اسکندرِ اعظم اور جولیس سیزر کے بعد نپولین کو سب سے بڑا سپہ سالار اور فاتح تسلیم کیا گیا ہے۔ نپولین کی جوانمردی اور بہادری سے تو کسی کو انکار نہیں بلکہ اسکی شخصیت کے لئے ہر شخص کے دِل میں احترام کے جذبات موجود ہیں لیکن اُس کا مقابلہ ٹیپو رح سے کیا جائے تو ٹیپو رح کی شخصیت زیادہ شاندار دِکھائی دیتی ہے۔

نپولین کی قوم نے اس کا پوری طرح ساتھ دیا اور عوام ہر معرکہ میں دِل وجان سے شامل ہوئے۔ اس کے افسر اس کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے لیکن ٹیپو سُلطان کے اُمراء و وُزراء تخت نشینی سے لے کر اخیر تک اس سے غدّاری کرتے رہے۔ سُلطان کی اولو العزمی کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ غدّاری نہ ہوتی تو اس کی فتوحات کا دائرہ نپولین سے زیادہ وسیع ہوتا۔

نپولین کو جب اُمراء کی غدّاری کے سبب شکست ہوئی تو اس نے اپنے وطن کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قید کر دیا گیا اور اسی حالت میں اس دُنیا سے رُخصت ہوا۔

ٹیپو کو جب اُمراء کی سازش کی وجہ سے شکست ہوئی تو اُس نے میدانِ جنگ میں وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شمشیر بکف مرنا پسند کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیر کی ایک دِن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے اور یہی چیز ٹیپو رح کو نپولین پر فوقیت دیتی ہے۔

ٹیپوؒ

کی شکست

درا صل ہندوستان کی آزادی کا خاتمہ تھا

ہندوستان کی آئندہ نسلیں ٹیپو کی یاد کو ہمیشہ عزیز رکھیں گی۔

اس ٹیپو کو جو "شہری ٹیپو" تھا "شہید ٹیپو" تھا

اور بہادر ٹیپو

تھا

ٹیپو اور جمہوریت

پروفیسر عبدالمجید خان ایم۔اے
(فیلو پنجاب یونیورسٹی و پروفیسر ایف سی کالج لاہور)

اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے سب سے بڑے شہید یعنی ٹیپو سلطان کی زندگی کے حالات پر مجھ سے کہیں زیادہ قابل و فاضل مقررین آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ میری تقریر کا چونکہ وقت کم ہے۔ اِس لئے میں اِس موقع پر صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

وہ حضرات جنھوں نے تاریخِ ہند کا مطالعہ غور و فکر اور بے تعصّبی کے ساتھ کیا ہے اس کھُلی ہوئی حقیقت سے باخبر ہیں کہ قدیم اہلِ روما کی طرح انگریز بھی ہمیشہ

اسی اصول کے قائل رہے ہیں کہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" واقعہ یہ ہے کہ "ہندوستان میں انگریزی حکومت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۴۸ء میں نواب نظام الملک والئی حیدر آباد کی وفات پر انکی جانشینی کے جھگڑوں اور تختِ کرناٹک کے بیک وقت دو دعویدار، چندا صاحب اور محمد علی کی باہمی کشمکش میں دخل درمعقولات شروع کیا۔ بنگال میں سراج الدولہ اور امی چند کے تعلقات کشیدہ تھے، چنانچہ کلائیو اور اس کے لگے بندھوں نے اس کشیدگی سے اپنے ہاتھ خوب رنگے اور اس طرح کبھی ایک رئیس کو دوسرے رئیس کے خلاف بھڑکا کر اور کبھی ملک کی مختلف قوموں میں سیاسی بے چینی کا بیج بو کر ہندوستان میں رفتہ رفتہ انگریزی حکومت کا دائرہ بڑھایا گیا۔

بڑے بڑے مورخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ۱۷۹۴ء میں مادھوراؤ سندھیا کی وفات کے بعد انگریزوں کو پوری طرح یقین تھا کہ اس وقت ہندوستان میں ان کا ایک ہی زبردست حریف ہے اور وہ ہے میسور کا مسلم فرمانروا ٹیپو سلطان! چنانچہ کارنوالس اور ویلزلی دونوں نے ٹیپو کا قلع قمع کر دینے کے لئے جبر وقہر سے کام لیا۔ ایک مرتبہ مدراس کے گورنر نے مارکوئس ویلزلی کو لکھا کہ "ٹیپو کے ذرائع اور وسائل ہمارے ذرائع اور وسائل سے کہیں زیادہ تیز ہیں۔" چنانچہ ٹیپو سلطان کو بے دست و پا کر دیا اور میسور کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ یہ تھیں وہ دو تجویزیں جو ہر وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے تھیں۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ ۱۷۹۳ء میں جب ایک فرانسیسی مدبر موسیو کرلیمنٹ نے وزارتِ فرانس کے سامنے مجلسِ مدافعت کی سرکاری

رپورٹ پیش کی۔ تو اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ "انگلستان کی ساکھ فرضی دولتمندی پر قائم ہے ورنہ انگریز قوم کا اصلی سرمایہ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا ہے۔ ایشیا، پرتگال اور ہسپانیہ انگریزی مصنوعات کی کھپت کی بہترین منڈیاں ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم یہ منڈیاں انگریزوں پر بند کر دیں، اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ منڈیاں تمام دُنیا کے لئے کھول دی جائیں۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم لزبن اور برازیل پر دھاوا بول دیں اور ہندوستان میں امدادی فوج سے ٹیپو سُلطان کو کمک پہنچائیں۔"

ایک بہت بڑا جمہوریت پسند

ایک سچا اور مخلص مسلمان ہونے کی حیثیت سے ٹیپو سُلطان اپنے سیاسی معتقدات میں ایک جمہوریت پسند انسان ہی ہو سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظِ "سلطان" چسپاں دیکھ کر خوش نہ ہوتا تھا۔ اسکے برعکس وہ اپنے آپ کو محض "شہری ٹیپو" کہا کرتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔ اتفاق سے اس پر آشوب زمانے میں فرانس میں بھی ایک قسم کی جمہوری حکومت قائم تھی۔ چنانچہ ٹیپو سُلطان نے بھی فرانسیسیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ پھر چونکہ ٹیپو اپنی جگہ ایک خود مختار تاجدار تھا اس لئے ماریشس کے فرانسیسی گورنر کے پاس سفیروں کو بھیجنے میں بالکل حق بجانب تھا۔

یہاں وہ دو اہم باتیں مدِ نظر رکھنا چاہیئں جو ان طریقوں اور دیسہ دوانیوں

پر روشنی ڈالتی ہیں جنہیں انگریزوں نے اس وقت انتہائی سیاست کے ساتھ برتا:

الف: ۱۷۸۸ء میں یعنی اس وقت سے دس برس پہلے جب ٹیپو نے اپنے سفیروں کو مارشس بھیجا، لارڈ کارنوالس نے پونا کے انگریز ریزیڈنٹ میلٹ کو لکھا کہ "میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ فرانس کے ساتھ جنگ کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹیپو سے ہمارے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے ساتھ ایک زبردست تعاون اس ملک میں ہمارے مفاد کے لئے ازبس ضروری ہے۔"

ب: اس سے بہت پہلے کہ ٹیپو کے سفیر مارشس جانے کیلئے سرنگاپٹم سے رخصت ہوئے، ویلزلی نے جو اس وقت لارڈ مارنگٹن تھے، محکمۂ راز میں ایک سکیم کا خاکہ تیار کیا۔ جس میں ان تمام اقدامات کا ذکر تھا جو "ٹیپو سلطان اور فرانس کی متحدہ کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے ضروری تھے۔"

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ٹیپو سلطان شہنشاہیت کا ایسا کھلا ہوا مخالف تھا اور ایسا سچا محبِ وطن کہ اس نے ترکی کے خلیفہ سلطان سلیم ثالث کے اس پروانے کی بھی پروانہ کی جس میں خلیفہ نے ۱۷۹۸ء میں برطانوی وزارت کے ایما سے ٹیپو سلطان کو قسطنطنیہ سے یہ لکھا تھا: کہ "ان بے دین دشمنانِ اسلام فرانسیسیوں کی مخالفت بسا ضروری ہے۔"

ایک بہادر سپاہی

ٹیپوُ وہ جانباز سپاہی تھا جس کی شجاعت اور بہادری کے کارنامے اتنے ہیں کہ اس مختصر سی تقریر میں نہیں سما سکتے۔ سرِدست اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس وقت جب اس کے دار السلطنت سرنگا پٹم پر آخری حملہ کیا گیا تو اس کے باوجود کہ اس کے حریفوں کی قوت اس کی قوت سے کہیں زیادہ تھی اور وہ اس قلعے کی حفاظت کر رہا تھا جس کے اِردگِرد ایک زبردست انگریزی فوج اور اس کے ساتھ نظام، میسور اور ٹراونکور کے لشکر کے پرے کے پرے پڑے ہوئے تھے۔ ٹیپو سلطان نے اپنی بے نظیر شجاعت اور قوتِ برداشت کا ثبوت دیا۔ اور مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوا۔ اِس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر اس کا ایک مسلمان جرنیل غدّاری نہ کرتا تو سرنگا پٹم کے خلاف نہ کوئی یورش کی جا سکتی تھی نہ اسے فتح کیا جا سکتا تھا۔

اس موقع پر بسبیلِ تذکرہ کورگ کے راجہ کے اس کمینہ اور غدّارانہ طرزِ عمل کا ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہو گا جس پر تاریخ کی یہ شہادت موجود ہے کہ اس نے سرنگا پٹم کی تسخیر پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ اس راجہ کو ٹیپو سے ازلی کاوش تھی، ظالم اس وقت یہ بھی بھول گیا کہ ٹیپو کی شکست دراصل ہندوستان کی آزادی کا خاتمہ تھا۔ بہرحال ہندوستان کی آئندہ نسلیں ٹیپوُ کی یاد کو ہمیشہ عزیز رکھیں گی —— اس ٹیپو کو، جو "شہری ٹیپو" تھا "شہید ٹیپوُ" تھا اور "بہادر ٹیپوُ" تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا ہندوستان کی آزادی

اور اسلام کی سربلندی کے لئے کیا۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اس کی جان میں جان رہی اور سانس قائم، اس نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ آج مسلمان نوجوانوں کو نہایت سختی کے ساتھ یہ عہد کرنا چاہیئے کہ وہ ٹیپو کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے مردانہ وار جدّوجہد کریں گے کیوں کہ ایک سچّے اور پکّے مسلمان کی شان ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ غلامی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس رُوئے زمین پر بدترین لعنت اگر ہے تو غلامی!

سُلطان کی جدّت پسندی

ٹیپو سلطان دُنیا میں ایک نیا نظام قائم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نظامِ کہن کی ہر چیز اسے ناپسند تھی، چنانچہ اس نے غلامی کا خاتمہ کیا۔ نئے سکّے جاری کئے اور مہینوں کے نام تک بدل دیئے۔ اس نے اپنی ریاست کے پرانے شہروں کے نام تبدیل کرکے نئے نام رکھے۔ سلطان کی طبعِ جدّت پسند کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

پُرانا نام	نیا نام	پُرانا نام	نیا نام
ڈنڈیگل	خالق آباد	کشنگری	فلک الاعظم
پاؤگڈھ	ختمی	سنگل ورگ	مظفّر آباد
پنوکنڈہ	فخر آباد	قلعہ بل	منظر آباد
ملولی	گلشن آباد	دیون ہلی	یوسف آباد
ہسکوٹہ	اسلام پور	سیرنگپٹن	ظفر آباد
بلاری	ثمر پٹن	کوئمبور تور	سلام آباد
قلعہ گتی	فیض حصار	نندی گڑھ	گردوں شکوہ
میسور	نظر آباد	سرا	رستم آباد
کلیکوٹ	اسلام آباد	بنگلور	دار السُرور
ماگڑی	ساون گڑھ	قلعہ چیتلدرگ	فرحیاب حصار

ٹیپو نے جس
مقصد کے لئے اپنی جان دی
تھی ہم اُسے آج تک حاصل نہیں
کر سکے۔

ٹیپو سُلطان
بہادروں کی طرح اپنے وطن کی
حفاظت کرتا ہُوا شہید ہُوا

سلطانِ شہیدؒ

(کامریڈ باری)

تاریخِ وطن میں سلطان شہید کی شخصیت اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ اُس نے اُس زمانے میں ہندوستان کو اجنبیوں کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دی۔ جب ہندوستان کے دُوسرے والیانِ ریاست قومیتِ متحدہ کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے۔ سلطان کی زندگی کا یہی مقصد تھا۔ اس نے اسی مقصد کے لئے اپنی جان دی۔ سلطان پہلا ایشیائی حکمران ہے جس نے ہندوستان کے مسائل کو بین الاقوامی زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ سلطان کی شہادت کے ۱۴۱ برس بعد آج ہندوستان کو ان دونوں مسائل کا سامنا ہے قومیتِ متحدہ اور

بین الاقوامیت۔

گزشتہ دو تین سال سے "ٹیپو ڈے" منایا جا رہا ہے۔ مشاہیر کی یادگاروں سے قومیں اپنے اندر نئی زندگی پیدا کر لیتی ہیں۔ تعجب نہیں کہ ہندوستان اپنے محسنوں کی سیرت کو سامنے رکھ کر اپنے لئے بھی کوئی مقام پیدا کر لے ٹیپو سلطان تنہا مسلمانوں کا ہیرو نہیں۔ وہ سارے ہندوستان کا ہیرو ہے، ٹیپو نے جس مقصد کے لئے جان دی تھی ہم اسے آج تک حاصل نہیں کر سکے!

ٹیپو نے میدانِ جنگ میں اپنے باپ کے تاج و تخت کو ورثہ میں پایا اس تاج و تخت کو آزادیٔ وطن پر قربان کرنے میں ٹیپو سلطان نے کبھی دریغ نہ کیا۔ وہ بہادروں کی طرح اپنے وطن کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہوا۔

جب ویلزلی ہندوستان پہنچا تو اس کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا کہ ٹیپو سلطان کو کیونکر شکست دی جائے! اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تنہا برطانوی فوجیں ٹیپو سلطان سے جنگ نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ ویلزلی نے روایتی عیاری سے کام لے کر مرہٹوں اور نظام کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ مرحوم مجلسِ اقوام کی طرح ویلزلی نے بھی "امنِ ہندوستان" کے لئے ایک دستاویز مرتب کی تھی۔ اس قرطاسِ امن کو سب سڈی ایری سسٹم کہتے ہیں۔ موت و ہلاکت کے اس قرطاس پر سب سے پہلے نظام نے دستخط کئے۔ ٹیپو نے ویلزلی کے اس دامِ تزویر میں گرفتار ہونے سے انکار کر دیا۔ میسور ایک آزاد ریاست تھی۔ ویلزلی میسور کے حکمران کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے بنائے ہوئے سسٹم

میں شریک ہوتا۔ ویلزلی کی یہ خواہش کہ دربارِ میسور میں کوئی فرانسیسی نظر نہ آئے، آزاد حکمرانوں کیلئے یہ ایک مضحکہ خیز مطالبہ تھا۔ سب سڈی ایری سسٹم میں شامل ہونے سے ٹیپو نے انکار کر دیا۔ یہ کون سی بڑی خطا تھی؟ کون سا جرم تھا؟ لیکن ویلزلی نے اس انکار کو بنائے مخاصمت قرار دیتے ہوئے ٹیپو کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ میسور کی آخری لڑائی کے جواز میں ویلزلی کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ نیلسن کی کامیابی کے بعد ویلزلی نے اپنی فوجوں کو سلطنتِ خداداد میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ سلطان سرنگا پٹم میں محصور تھا۔ انگریزی توپخانہ کی شدید گولہ باری نے قلعہ میں شگاف کر دیئے۔ سلطان مردانہ وار دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ انگریزی فوجیں سلطان کو گرفتار کرنے کی غرض سے قلعہ میں داخل ہوئیں۔ کشتگانِ ویلزلی کے ایک ڈھیر میں ایک متبسم نعش دکھائی دی۔ یہ تھا دکن کا شیر!

"بے شمار جگر دار غازی شہید ہوئے۔

صرف وہی باقی ہیں

جو آج تیرا ماتم کر رہے ہیں"۔

ٹیپو کی موت پہ کلکتہ کی برطانوی آبادی نے اپنے گھروں میں چراغاں کیا۔ کلکتہ کی عدالتِ عالیہ کا میرِ عدل بھی جذبات پر قابو نہ پا سکا، مرکزی کلیسا میں شکرانے کی نماز ادا کی گئی۔

ٹیپو کے نزدیک راجا اور پرجا کے درمیان کسی وکیل کی ضرورت نہ تھی چنانچہ اس نے میسور میں جاگیریت ختم کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میسور کا

کسان بہار، بنگال اور اودھ کے کسان کی طرح بے انتہا مصائب کا شکار نہیں۔

دکن نے ایک شیر پیدا کیا جو سیاست میں وطن پرور اور اقتصاد میں کسان دوست تھا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگِ آدم، ننگِ دیں ننگِ وطن

اقبال

غدّارانِ وطن

عبداللہ بٹ بی۔اے (آنرز)

غدّاری ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ غدّاروں کا وجود ہی کسی مُلک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ غدّاری کے ہاتھوں حضرت مسیحؑ ایسے مقدّس انسان اور عظیم المرتبت پیغمبر بھی نہ بچ سکے۔ حضرت مسیحؑ کو شناخت کرانے والا ان کا اپنا حواری یہود اتھا۔ مستعصم باللہ کے خلاف ہلاکو خان سے سازباز کرنے والا اور اسکو بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والا اس کا اپنا وزیر ابنِ علقمی تھا۔ راون کے ساتھ اس کے بھائی نے غدّاری کی۔ دُور کیوں جائیں۔ بنگال میں سراج الدّولہ کی تباہی اور انگریزی اقتدار کے قیام کا باعث

میر جعفر تھا۔ اپنوں کی معمولی سے معمولی غدّاری وہ کام کرتی ہے جو دشمن کی بڑی سے بڑی قوّت نہیں کر سکتی۔ غدّاری کہیں ہو، کسی رنگ میں ہو، نتائج کے اعتبار سے ایک چیز ہے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ غدّاری کی داستان ہے۔

علّامہ اقبالؔ مرحوم اس حقیقت کو بیان فرماتے ہیں :-

مُردہ جعفر زندہ رُوح اُو ہنوز　　　　کئے شب ہندوستان آید بروز

اصل اُو از صادقے یا جعفرے است　　　　ملّتے را ہر کجا غارت گرے است

الاماں از جعفران ایں زماں!　　　　الاماں از رُوحِ جعفر الاماں!

جب کسی قوم میں غدّاروں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اُس قوم کو مٹانے کے لئے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ قوم خود بخود موت کی آغوش میں چلی جایا کرتی ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں، قومی مجلسوں اور ملّی اداروں کی ناکامی کا سب سے بڑا باعث یہی غدّاری ہے۔ ہر بیرونی حملہ اور غیر ملکی اقتدار کے قیام میں غدّاری کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ ٹیپو سلطان غدّار دوستوں کے اعتبار سے بہت ہی بدقسمت انسان تھا لیکن سُلطان کی اولوالعزمی، دلیری اور بہادری دیکھئے کہ اِن حالات کے باوجود وہ اپنے بلند مقصد کے حصول کے لئے آخری وقت تک لڑتا رہا۔

اس کے بہترین دوست انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے مصاحب اور حاشیہ نشین اس کی جان لینے کے درپے تھے۔ اس کے وزراء اندرونی طور پر اس کے دشمن ہو چکے تھے۔ اس کے عہدہ دار چند سنہری اور روپہلی مصلحتوں کے لئے اپنا ضمیر غیروں کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ غرضکہ اس کی سلطنت

کا کوئی گوشہ ان غدارانِ ملک سے خالی نہ تھا۔ در و دیوار سے غداری کی بدبو آ رہی تھی۔ سلطان کے ان نام نہاد دوستوں کی نمک حرامی اور غداری کا ذرہ ذرہ گواہ تھا مگر سلطان کو اس کا علم نہ تھا۔

غداری اپنا کام کر چکی تھی کہ ٹیپو کو اس کا علم ہوا لیکن اس کا یہ علم اس کو اس غداری، دھوکہ اور فریب کے نتائج سے بچا نہیں سکتا تھا۔

ان غداروں کی فہرست میں میر صادق، میر غلام علی لنگڑا، میر معین الدین، میر قمر الدین، بدر الزّمان نائطہ، میر قاسم علی اور پورنیا بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کے خلاف حیدر آباد، ارکاٹ اور مدراس میں سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں سے ان غداروں کو ہر قسم کی امیدیں دلائی گئیں اور تھیلیوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ ان غداروں اور ہمسایہ ریاستوں کو ذاتی عناد اور آئندہ کی خوشگوار توقعات نے سلطنتِ خداداد کی تباہی پر آمادہ کیا۔ ان بدبختوں کی ضمیر فروشی اپنا کام کر گئی۔ ٹیپو سلطان نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جہاد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انگریزوں نے خوشی کے شادیانے بجائے اور فخر کے ساتھ کہا:

"آج ہندوستان ہمارا ہے!"

میر صادق

ارکاٹ میں نواب حیدر علی کی ملازمت میں داخل ہوا آہستہ آہستہ ارکاٹ کا ناظم مقرر ہوا۔ ٹیپو سلطان کے عہد میں چیف سکرٹری کے عہدہ پر پہنچا۔ صرف میسور ہی کی نہیں بلکہ ہندوستان کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ یہ شخص اپنے عہدے سے معزول ہو جانے کے بعد پھر بحال کر دیا گیا۔ سلطنتِ

خُداداد کے مٹانے کے لئے جتنی سازشیں ہوئیں، ان سب میں اس کا ہاتھ تھا۔

میر نظام علی خاں والیِ حیدرآباد اپنی ریاست کے بقاء و استحکام کے لئے میسور کے خلاف ہمیشہ سازشوں کی پُشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا میر صادق کی وجہ سے سلطان کی تمام اطلاعات حیدرآباد، ارکاٹ، مدراس اور کلکتہ پہنچتی رہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ سلطان کی تیاریوں کا پیش از وقت علم ہو جایا کرتا تھا اور اس کے تمام منصوبے ناکام رہے۔ سلطان جس وقت ہندوستان کی آزادی کے لئے آخری بار انگریزوں سے مقابلے کے لئے نکلا تو اس شیطان سیرت انسان نے قلعے کا دروازہ بند کر لیا تاکہ سلطان زندہ واپس نہ آسکے۔ سُلطان مردانہ وار لڑ رہا تھا اور انگریز اُسے شناخت کرنے سے قاصر تھے مگر اس بدبختِ ازلی کی اطلاع دہی پر ہندوستان کا یہ مایۂ ناز سپوت محصور کر لیا گیا اور دادِ شجاعت دیتا ہوا موت کی آغوش میں چلا گیا۔ سُلطان کی شہادت کے بعد سلطنت کی تقسیم کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ سُلطان کی اولاد کو محرُوم کرنے کا مشورہ دینے والا بھی یہی غدار تھا۔ اِس دُنیا میں جب تک ایک متنفس بھی موجود ہے اِس غدارِ وطن پر لعنت بھیجتا رہے گا: ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

میر غلام علی لنگڑا

یہ شخص بھی ادکاٹ کی تباہی کے بعد سلطان حیدر علی کی ملازمت میں آیا تھا - یہ بہت چالاک اور تیز فہم تھا اور اس وجہ سے اس کو ترکی میں سفیر بنا کر بھیجا گیا - حد درجہ متکبر انسان تھا - ترکی سے واپس آیا تو بہت سا سامانِ تحائف اپنے پاس ہی رکھ لیا - تلاشی پر وہ تمام مال برآمد ہو گیا اور اسے نظر بند کر لیا گیا - لیکن سلطان نے اسے معاف کر دیا اور "وزارتِ بحریہ" کا قلمدان اس کے سپرد کیا - جب سلطان ٹیپو رح کی شہادت کے بعد سلطنت کی تقسیم ہونے لگی اور سلطان شہید رح کے شہزادے کو تخت نشین کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو یہی بد خصلت انسان تھا جس نے کمیشن کے سامنے کہا:

"افعی کشتن و بچہ اش را نگہ داشتن کارِ خردمنداں نیست"

میر قمر الدین و میر معین الدین

یہ دونوں سلطان کے سوتیلے ماموں تھے - میر معین الدین کی بیٹی سلطان کی منکوحہ تھی - نواب حیدر علی کے وقت بھی میر معین الدین مرہٹوں سے جا مِلا تھا اور اس کے عوض گرم کنڈہ کی جاگیر حاصل کی تھی - ایک دفعہ حیدر علی کی موت کی افواہ اُڑی تو میر قمر الدین جو اس وقت کسی اور جگہ تھا، فوج لے کر سرنگا پٹم آیا تاکہ خود تخت حاصل کرے - سلطان نے اس کی اطلاع پا کر دونوں کو نظر بند کر دیا مگر بعد میں پھر رہا کر دیا - انگریزوں اور نظام سے ان دونوں بھائیوں نے گرم کنڈہ کی جاگیر لکھوا لی اور وعدہ کیا کہ وہ سلطان کے خلاف ہر قسم کی کاروائی کریں گے - معین الدین تو سلطان کی شہادت کے دن ہی

خندق میں گر کر مر گیا۔ لیکن میر قمر الدین نے اپنی غداری کا معاوضہ حاصل کیا۔

پورنیا یہ شخص نواب حیدر علی کی ملازمت میں داخل ہوا۔ ترقی کرتے کرتے وزیر مالیات کے عہدہ تک پہنچا اور بعد میں دیوان بنا دیا گیا۔ سلطنت کے تمام محکموں پر اس کا اقتدار تھا۔ یہ غداروں کا سرغنہ تھا اور ہر سازش میں شریک ہوتا تھا۔ بعض اوقات سازش کی رہنمائی بھی یہی کرتا۔ چنانچہ یہی غدارِ ملک تھا جس نے عین لڑائی کی حالت میں تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے فوج کو محاذ سے واپس بلا لیا تھا۔ یہ ترمل راؤ اور کشن راؤ کے ذریعے تمام اطلاعات لارڈ کارنوالس کو پہنچاتا رہتا تھا۔ میسور کی تیسری اور چوتھی لڑائی اسی ننگِ انسانیت کی سازش کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ باؤنگ نے لکھا ہے:

"سیاسی سازش کا صلہ تھا کہ پورنیا کو میسور کا دیوان بنایا گیا۔"

میر قاسم علی اس کی تمام عمر سلطان کی ملازمت میں گزر چکی تھی۔ سلطان کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ چنانچہ اس کو وقتاً فوقتاً انعاماتِ فاخرہ سے نوازہ جاتا تھا۔ یہ سرنگاپٹم کے قلعہ کا افسر تھا۔ میر قاسم علی نے حیدر آباد جانے کے لئے رخصت طلب کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رخصت مل گئی تو یہ شخص حیدر آباد جانے کے بجائے انگریزوں سے جا ملا اور انگریزی فوجوں کو قلعے میں نہایت ہی موزوں جگہ پر لا کھڑا کیا۔ چنانچہ جنرل میڈوز لکھتا ہے:

"قلعہ کا یہ پہلو کمزور ترین تھا۔ انگریزی سپہ سالاروں کو جس شخص نے اس کمزور پہلو سے مطلع کیا وہ یہی میر قاسم علی تھا۔"

اس دشمنِ وطن کی کارروائی یہیں ختم نہیں ہو جاتی جنرل میڈوز لکھتا ہے:

"دوپہر کے وقت جب حملے کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو جنرل بیرڈ خندقوں سے فوج لے کر نکلا اور دریا پار ہو کر فصیل پر چڑھا۔ انگریزی فوج میں جو شخص سب سے پہلے فصیل پر چڑھا وہ جنرل بیرڈ تھا۔ اس کی راہ نمائی کے لئے ایک شخص اس سے آگے آگے تھا۔ وہ شخص میر قاسم علی تھا جو قلعے کی فصیل پر بیرڈ سے پہلے چڑھا۔"

یہ شخص غداری میں بھی سبقت لے گیا اور آنے والی نسلوں کو مجبور کر گیا کہ وہ اس پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتی رہیں۔ اگر یہ شخص غداری نہ کرتا تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی اور ہوتا۔ لارڈ ولزلی اچھی طرح جانتا تھا:

"اگر یہ شہر ہمارے قبضے میں آ گیا تو ہندوستان کی قسمت کے دروازے ہمارے لئے کھل جائینگے۔"

اس قلعے کو فتح کر لینے کا مطلب شہر پر قبضہ ہی تھا اور جب یہ شہر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تو ہندوستان کی قسمت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔"

بدرُ الزمان نائطہ

یہ شخص سلطان کے خلاف اس وجہ سے ہوا کہ سلطان نے اس کی لڑکی کی شادی سلطان

برہان الدین سے کر دی تھی ۔ نائطہ نے اسے اپنی عالی نسبی کی توہین سمجھا، لڑکی نے خودکشی کر لی ۔ میر صادق نے سلطان سے شکایت کی کہ بدر الزمان سلطنت کا خیر خواہ نہیں ہے ۔ سلطان نے بدر الزمان کو نظر بند کر دیا مگر چند دن بعد معافی دے کر پھر اسے وزیر بنا لیا ۔ بدر الزمان نے انتقام لینے کی خاطر سلطان کی مخالفت شروع کر دی ۔ اس شخص نے ذاتی رنجشوں کی وجہ سے "سلطنتِ خداداد" کے مٹانے میں بہت مؤثر حصہ لیا ۔

سلطان کے کیریکٹر کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ بہت رحمدل تھا ۔ اس نے اپنے وزیروں کے جرموں کے ثبوت کے باوجود ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا اور ان کے اعزاز و مراتب بڑھائے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نمک حرام سلطان کے ساتھ غداری سے باز نہ آئے ۔ نواب حیدر علی نے ٹیپو کو لکھا تھا :

> "میرے بعد پورنیا ، میر صادق علی اور میر غلام علی
> کو قتل کر دینا ۔ اِن کی نیتوں میں فتور ہے ۔"

اے کاش ! ان الفاظ کو عملی جامہ پہنایا گیا ہوتا ۔ اے کاش ! یہ الفاظ شرمندۂ معنی ہوئے ہوتے !

یہاں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یہ غدارانِ وطن کسی نہ کسی طرح سلطان ٹیپو کی شہادت کے دِن ہی مارے گئے ۔ ان غداروں نے دُنیا کی وقتی خوشیوں اور آسائشوں کے لئے نہ صرف اپنے ایک محسن بلکہ

اپنے عزیز وطن سے غدّاری کر کے آخرت کا ابدی عذاب خریدا۔ آنے والی نسلیں ہمیشہ ان لوگوں پر لعنتیں بھیجتی رہیں گی ؎

این جہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدّار را مولا کجا است

سُلطانِ شہیدؒ

مولانا سیماب اکبرآبادی

پُوچھ اے میسُور اپنے ماضیٔ ضوناک سے
"وہ برہنہ شمشیر" اِک چمکی تھی تیری خاک سے
جس کی تابش نے بھری محفل کو خیرہ کر دیا
ظلم سے چمکا ہُوا ماحول تیرہ کر دیا
پرورش محلوں میں پائی تھی نہیبِ جنگ نے
یا اماں پھُولوں میں لی تھی حُریت کے رنگ نے

اے سرنگا پٹم! اے عہدِ کمالِ حیدری
ہے امانت تجھ میں تصویرِ جلالِ حیدری
وُہ شہیدِ ذوقِ آزادی، وُہ غازی، وُہ جواں
جو بدلنا چاہتا تھا نقشۂ ہندوستاں
جس کی نظروں میں وطن کا حال و استقبال تھا
جو دکّن کی گود میں اِک آتشِ سیال تھا
ہند میں جو چاہتا تھا ہندیوں کی برتری
خود شناسی اور خودداری تھی جس کی خودسری
آہ! خود اسکے وطن نے اس سے کیں غداریاں
یاد ہیں وہ ذہنِ قومیت کی سازش کاریاں
ڈیڑھ سو سال اسکی رحلت پر ابھی گزرے نہیں
دارِ کہنہ سے وطن کی وسعتیں پھر چیخ اٹھیں
ہے یہ اس سلطانِ آزادی سے کاوش کا مآل
جور و استبداد سے ہندوستان ہے پائمال
یہ مصیبت اس سے غداری کی ذمہ دار ہے
یہ غلامی رُوحِ آزادی کی اِک پھٹکار ہے
ہے ازل ہی سے تری تقدیر میں دار و رسن
ڈوب جا آفت کے طُوفانوں میں بغیرتِ وطن

اے شہید، اے مردِ میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں، لاانتہا تجھ پر سلام

ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا سامان تھا
ورنہ تو ہی عہدِ آزادی کا اک عنوان تھا

مصر سے تا روم پہنچی تیری آوازِ بلند
گونج اس کی آج بھی باقی ہے باندازِ چند

اُڑ رہے ہیں آج جو ماحول میں سیلاب کے
یہ بھی کچھ ذرے ہیں تیری خاکِ آتش تاب کے

اپنے ہاتھوں خود تجھے اہلِ وطن نے کھو دیا
آہ کیسا باغبانِ شامِ چمن نے کھو دیا

آہنی پیکر ترا اب ہاتھ آ سکتا نہیں
لے کے مشعل بھی کوئی ڈھونڈے تو پا سکتا نہیں

تھا مقدر تیری فطرت میں شہادت کا شرف
کر دیا منصب نے تیرے ناگہاں خنجر بکف

تو بدستور اب بھی زندہ ہے حجابِ گور میں
جذب ہو کر رہ گیا ہے ہستیٔ پُرشور میں

عین بیداری ہے یہ خوابِ گراں تیرے لئے
ہے شہادت اک حیاتِ جاوداں تیرے لئے

بے نیازی اپنے اہلِ ملک کی کر دے معاف
خوابگاہِ پاک سے اِک دن اُٹھا بھی دے غلاف

آ پھر اربابِ وطن کی مشکلیں آسان کر
پھر شریکِ جنگِ آزادی ہو سینہ تان کر

عین اُس وقت۔۔۔

جب کہ دونوں وقت مل رہے تھے ـــــ اور

آفتاب شفق کے خُون میں غوطے لگا رہا تھا ـــــ

"سلطنتِ خداداد" کا یہ مہرِ منیر اور حُرّیت وبسالت

کا نیّرِ اعظم سرنگاپٹم کی دیواروں پر اپنی

حسرت بھری الوداعی شعاعیں

ڈالتا ہُوا ہمیشہ کیلئے

غرُوب ہو

گیا

؎

ٹیپو سلطانؒ کی شہادت

شیرِ میسورؒ کی آخری گرج

جناب مولانا علم الدین صاحب سالک ایم۔ اے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج۔ لاہور۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہدِ حکومت بدعہدیوں کی ایک مسلسل روئداد ہے۔ جس کا ایک ایک حرف خون میں ڈوبا ہوا اور جس کی ایک ایک سطر لہو میں تربتر ہے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کا لرزہ خیز واقعہ بھی اسی خونچکاں داستان کا ایک حصہ ہے۔ ایک مؤرخ نے سچ کہا ہے کہ:-

"کمپنی بہادر کے اہلکار میسور کی جنگِ سوم کا تو صرف بواعث ... کرنے سے قاصر تھے مگر میسور کی جنگِ چہارم کے لئے وہ سخت مجرم ہیں"

(باسو۔ جلد دوم ص۳۱۰)

سرنگاپٹم کی صلح کے بعد سلطان ٹیپو نے جس بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا ثبوت دیا اور ملک کی حالت کو بہتر بنانے اور ریاست کی اصلاح کرنے میں جس انہماک، محنت اور جفاکشی سے کام لیا اس کی مثال تاریخ کے صفحات پر بہت کم ملتی ہے۔ سلطان کا یہ عدیم المثال تدبّر دیکھ کر دوست تو دوست دشمن بھی چلا اٹھے اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات پر تعریف اور تحسین کے پھول برسانے لگے۔

۱۷۹۲ء میں میسور کی تیسری جنگ کا خاتمہ معاہدہ سرنگاپٹم کی صورت میں ہوا اس معاہدے میں مرہٹے، نظام اور ایسٹ انڈیا کمپنی ایک طرف تھے۔ اس معاہدے کی رو سے سلطان ٹیپو کو اپنے نصف ملک سے دستبردار ہونا پڑا اور تیس لاکھ پونڈ بطور تاوان جنگ ادا کرنے پڑے اور دو بیٹے لارڈ کارنوالس کے حوالے یرغمال کے طور پر کئے۔ ان حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا اور ازسرِنو اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنا ایک مستقل مزاج حوصلہ مند انسان کا کام تھا۔ سلطان ٹیپو نے مردانہ وار ان حالات کا مقابلہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کر لیا۔ اس نے ایک مدّت قلیل میں اس رقم کے ادا کرنے کا بھی بندوبست کیا جو اتحادیوں کی اس کے ذمّہ بقایا چلی آتی تھی۔ اس نے ملک کے قدرتی ذرائع اور طبعی حالات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرکے ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فوجوں کی ازسرِنو

تنظیم کی۔ مُلک میں نئی نئی اصلاحات جاری کیں۔ وہ بگڑے ہوئے حالات پر قابو پاکر اور سلطنتِ خداداد کا وقار اور احترام حریفوں کی نظر میں قائم کرکے اُبھرا اور مطلعِ جہانبانی پر آفتابِ عالمتاب بن کر چمکا۔ جس کی نور بخش ضیاپاشیوں سے تمام ہندوستان کو جگمگا دیا۔ چنانچہ ایک انگریز مؤرخ ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"سلطان کی سیرت کا یہ ایک نمایاں پہلو ہے کہ اس نے سب سے اوّل نہایت شریفانہ اور معزز طریقے پر پوری باقاعدگی سے ان تمام بڑی بڑی رقوم کو ادا کیا جو اتحادیوں کی اس کے ذمّے چلی آتی تھیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان مایوس کُن حالات کے نیچے دب جاتا اور اپنی بدقسمتی پر ماتم کرکے حوصلہ ہار بیٹھتا۔ اُس نے اپنی تمام تر کوشش اور توجہ ان حالات کے درُست کرنے میں صرف کی جو تباہ کُن جنگ کی وجہ سے مُلک میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے پایۂ تخت کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کیا۔ فوجی رسالوں کو درُست کیا۔ پیادے بھرتی کئے اور انھیں منظم کیا اور اس کے ساتھ اُس نے اپنے ان باجگذاروں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، جن کے دماغ میں بغاوت اور خودسری کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ اُس نے زراعت کی طرف توجہ دے کر کاشتکاروں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ ان تمام اصلاحات کا نتیجہ یہ ہؤا کہ مُلک میں ایک مرتبہ پھر پہلی سی چہل پہل پیدا ہوگئی اور مُلک اپنی اصلی حالت پر آگیا"

(ڈسپیچز آف لارڈ ویلزلی جلد اوّل صفحہ ۶۶۹)

سلطان کی یہی بلند ہمتی اس کی تباہی کا پیش خیمہ اور اُس کی بربادی کا باعث ہُوئی۔ اسی نے اس کے رقیبوں کے سینے میں عداوت اور نفرت کی آگ سُلگا دی جو بہت جلد میسُور کی چوتھی جنگ کی صُورت میں رُونما ہُوئی۔

لارڈ مورنگٹن (جو بعد میں مارکوئیس آف ویلزلی کے نام سے مشہور ہوا) برطانیہ کا ایک جلیل القدر فرزند اور مایۂ ناز سپوت تھا۔ ہندوستان میں برطانیہ کا استحکام اسی کے دم سے وابستہ ہے۔ وہ ہندوستان میں قدم رکھنے سے پیشتر ہی سلطان کے عزم و ثبات، اس کی خداداد صلاحیتوں اور تعمیری سرگرمیوں کی داستان سُن چکا تھا اور لارڈ کارنوالس سابق گورنر جنرل ہند کی ہمنشینی نے اس کے دِل میں سلطان کے خلاف ایک قسم کا تعصّب بھر دیا تھا جس کی بنا پر وہ سلطان ٹیپُو کو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعمار پسندانہ عزائم کے لئے ایک مستقل خطرہ تصوّر کرتا تھا۔ چنانچہ ۲۳ر فروری ۱۷۹۸ء کو اس نے جو خط مسٹر ڈونڈس کے نام لکھا اس کے ایک ایک حرف سے قلبی خصومت اور دلی عداوت کی بُو آتی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ مورنگٹن عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی سلطان کا جانی دشمن ہو چکا تھا وہ لکھتا ہے کہ:

"اگر یورپ میں جنگ جاری رہی اور اس کی لپیٹ ہندوستان تک نہ پہنچی تو فرانسیسی سازشوں کا سلسلہ خود بخود منقطع ہو جائے گا اور اگر جنگ کا اثر ہندوستان میں آپہنچا اور ہمیں اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ہم اپنے

اتحادیوں کی تمام طاقت ٹیپو سلطان کے مقابلے میں طلب کریں تو نظام سے
کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جب اس کی فوج فرانسیسی افسروں کی کمان میں ہے
یا ان کے ایجنٹ وہاں کام کر رہے ہوں گے۔ اس وقت وہ ٹیپو ہی
کے نمائندے ہوں گے۔

اس خط کی عبارت اور لہجہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ سلطان ٹیپو کا خوف لارڈ مورنگٹن کے دماغ پر متسلط ہو چکا تھا اور اس زبردست حریف کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھ رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک نہ تو سلطان نے اس کے خلاف کوئی اقدام کیا تھا اور نہ ہی لارڈ مورنگٹن کو سلطان سے کوئی واسطہ پڑا تھا۔ یہ ہوائی بندوقیں راس امید میں بیٹھے بیٹھے چھوڑی جا رہی تھیں۔ حالات کو دیکھے بغیر اس قسم کی رائے قائم کرنا کہاں تک جائز تھا! اس کا فیصلہ ہم ارباب بینش کی انصاف پسندی پر چھوڑتے ہیں۔

لارڈ مورنگٹن اکتوبر ۱۷۹۷ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل نامزد ہوا، اور ۷، نومبر کو ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ دوران سفر میں بعض حالات ایسے پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے اسے چند یوم کے لئے راس امید پر ٹھہرنا پڑا اس وقت ہندوستان کی سیاسی بساط کے تین زبردست شاطر وہاں موجود تھے۔ ان میں ایک تو مدراس کا سابق گورنر جنرل میڈوز اور دوسرا جرنیل بیرڈ تھا جو کچھ عرصے کے لئے سلطان کی قید میں رہ چکا اور اسکے خلاف کئی جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ جرنیل میڈوز سلطان کا سخت دشمن تھا اور اس سے انتقام لینے کے لئے

ہر وقت مضطرب رہتا تھا، چنانچہ میسور کی تیسری جنگ کے بعد لارڈ کارنوالس نے سلطان سے صلح کرنی چاہی تو وہ خودکشی پہ آمادہ ہو گیا۔ اسکے علاوہ میجر کرک پیٹرک بھی وہاں موجود تھا جو ایک مدت تک پونا اور حیدرآباد کے درباروں میں ریذیڈنٹ رہ چکا تھا۔ اس نے گورنر جنرل کو بتایا کہ نظام، پیشوا اور سلطان ٹیپو کی فوجی حیثیت کیا ہے۔ ان کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف جو خیالات اس کے دل میں بٹھا دیئے وہ اور پختہ ہو گئے اور وہ ٹیپو سلطان کو انگریزی اقتدار کا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگا۔ متذکرہ بالا مکتوب انہی خیالات کا عکس ہے۔

لارڈ مورنگٹن مئی ۱۷۹۸ء میں کلکتہ پہنچا اور اس نے اپنے جلیل القدر عہدے کا چارج لیا، سلطان جو ایک سچے مسلمان کی طرح عہد کا نباہنا اپنا فرض سمجھتا تھا، اس موقعے پر اپنی صداقت کا اظہار کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ چنانچہ اس نے لارڈ مورنگٹن کی آمد پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مکتوب کلکتہ روانہ کیا:۔

"آپ کا وہ خط جس میں آپ نے اپنے آنے کی اطلاع دی ہے ہماری مسرت کا باعث ہوا ہے۔ آپ کے بخیریت پہنچنے کی خبر پڑھ کر میرے دل کو جو خوشی ہوئی، وہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتی۔ خداوند تعالےٰ کے فضل و کرم سے یہ امید ہے کہ دونوں سلطنتوں کے درمیان جو رشتۂ اتحاد قائم ہو چکا ہے وہ پہلے سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو جائے گا معاہدے کی پابندی اور دوستی کا نباہنا میرا مقصدِ وحید ہے۔ آپ بھی دوستی و مروت کے دل سے خواہاں ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ

اسی طرح رشتۂ اتحاد و یگانگت کو قائم رکھیں گے۔"

لارڈ مورنگٹن پر اس خط کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کے دِل میں ٹیپو کا چور بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہر ممکن ذریعے سے اُسے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔

سب سے پہلا الزام یہ لگایا کہ سلطان فرانسیسیوں کے ساتھ ملکر انگریزوں کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اسے ثابت کرنے کے لئے بیان کیا کہ سلطان نے ایک وفد ماریشس بھیجا، جس نے وہاں کے گورنر سے مدد کی التجا کی اور نپولین کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے اُکسایا۔ سلطان نے اس الزام کے متعلق لارڈ مورنگٹن کو لکھا کہ:-

"سلطنتِ خداداد میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو بحری تجارت کرتی ہے۔ اس مُلک سے چاول لے کر ان کا جہاز ماریشس پہنچا۔ واپسی کے وقت ماریشس کے چالیس باشندے یہاں آئے اور ملازمت کے طلب گار ہوئے۔ ان میں سے دس بارہ تو ملازم رکھ لئے گئے باقی واپس بھیج دیئے گئے۔

میرا یہ دِلی منشاء ہے کہ ہمارے درمیان جو معاہدہ سرنگا پٹم پر ہو چکا ہے اس کا حرف حرف پُورا کروُں۔ اتحادِ باہمی کو فروغ دوُں۔ دوستی اور اتفاق کے رشتے کو مستحکم کروُں۔ مَیں آج کل یا تو محل میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہوُں، یا کبھی کبھی سیر و شکار کو باہر چلا جاتا ہوں۔ ان حالات میں آپ کا یہ لکھنا کہ اتحادی اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور بصُورتِ دیگر جنگ

کا اشارہ کرتے ہیں۔ مجھے سخت متحیر اور ششدر کر رہا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے امید ہے کہ آپ درمیان میں کوئی ایسی بات نہ آنے دیں گے جس سے کدورت پیدا ہو۔"

اس خط کے بعد فرانسیسی تعلقات کو جنگ کی وجہ قرار دینا سخت ناانصافی ہو۔ ہمارے مؤرخ جو اسی کو جنگ کی وجہ قرار دیتے ہیں، شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس زمانے میں میسور کی حالت وہی تھی جو آجکل حیدر آباد یا کشمیر کی ہے۔ حالانکہ میسور ایک آزاد سلطنت تھی اور بین الاقوامی شہرت کی مالک تھی۔ اسے دیگر اقوام سے رشتۂ اتحاد قائم کرنے یا اعلانِ جنگ کرنے کا پورا پورا اختیار تھا۔ جس طرح آج یورپ کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں صلح و جنگ کا حق رکھتی ہیں اور تجارتی اغراض کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ خفیہ معاہدات کر سکتی ہیں، اسی طرح میسور کو بھی یہ حق حاصل تھا۔ جب آج یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں جنگ کے موہومہ خوف کو روکنے کے لئے ہر قسم کی جماعت بندی، فریق سازی یا پارٹی بازی کر سکتی ہیں تو میسور سے یہ حق کیونکر چھینا جا سکتا تھا۔ اس کو اس قاعدہ سے کیونکر مستثنےٰ سمجھ لیا گیا۔ شاید اسلئے کہ وہی اس وقت ہندوستان کا ایک آزاد حصّہ تھا اور وہاں کا حکمران خدائے واحد کا پرستار اور کالی نسل کا ایک فرد تھا؟ اگر یہی جنگ کی وجہ ہے تو یہ تعصّب اور تنگ نظری ہے۔ باہمی معاہدے، تجارتی تعلّقات اور ذاتی رقابتیں جنگ و جدل کا باعث نہیں بن سکتیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو پھر دُنیا میں ایک ساعت کیلئے بھی امن و امان اور ایک لمحے کے لئے بھی سکون و قرار قائم نہ رہ سکے۔

جیمز مِل سلطان شہید اور فرانسیسی تعلّقات پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

فرانسیسی معاہدے کو جنگ کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جس وقت میسور کی تیسری جنگ کے بعد سرنگا پٹم کا معاہدہ مرتب ہوا، اس وقت بھی فرانسیسی سلطان کے حلیف تھے اور ان کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اس وقت یورپ کی سیاسی فضا بے حد خطرناک تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ جانے کا ہر وقت احتمال تھا مگر ان ساری باتوں کے باوجود تجربہ کار سیاسی مدبّر اور کارآزمودہ لارڈ کارنوالس نے یہی مناسب سمجھا کہ آپس میں صلح صفائی کر لی جائے۔ اس معاہدے کے بعد یورپ کی سیاسی فضا میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ یہ حالات زیادہ پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ اس لئے ۲۰ر جون ۱۷۹۸ء کو لارڈ مورنگٹن کا حملے کے لئے تیاریاں کرنا اور جارحانہ اقدام کا فیصلہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ دو آدمی جزیرہ فرانس میں وارد ہوئے۔ وہاں کے گورنر نے ایک اعلان شائع کیا مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی تہ میں کوئی سازش کام کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فرانسیسی گورنر نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ہندوستان کی سرزمین میں باہم لڑوانے کے لئے ایسا کیا ہو اور اگر اس چیز کو مان لیا جائے کہ وہاں کے گورنر کے ساتھ ٹیپو سلطان نے کوئی خفیہ معاہدہ کیا تو اسے فی الفور منظرِ عام پر لانا عدم تدبّر اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس قسم کے معاہدے عام طور پر پوشیدہ اور پردۂ راز میں رکھے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ایک اعلان کا نفاذ سوائے شیخی، ڈینگ اور تفاخر کے اور کچھ نہیں۔ جسے کوئی مدبّر کسی قسم کی اہمیت دینی گوارا نہ کرے گا۔

دکن میں اس وقت تین زبردست طاقتیں تھیں ۔ نظام، مرہٹے اور سلطان شہید۔ ان تینوں طاقتوں کی حدود ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور یہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار بھی تھیں ۔ نظام اور مرہٹے اپنی فوجی طاقت کو ازسرِ نو منظم و مرتب کر رہے تھے ۔ ان کی فوجیں فرانسیسیوں کے زیرِ کمان تھیں ۔ نظام کی قوت کا زیادہ تر انحصار انہی فرانسیسی افواج پر تھا ۔ مرہٹے بھی فرانسیسیوں کی تعداد اپنی فوجوں میں بڑھا رہے تھے ۔ رقیبانہ حوصلہ مندیوں کا تقاضا تھا کہ سلطان شہید بھی اپنی فوجی طاقت کو ان کے برابر کرے، اور بہت ممکن ہے کہ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس نے اپنا یہ وفد جزیرہ فرانسس روانہ کیا ہو تاکہ وہ وہاں پہنچ کر سلطان کے لئے سپاہی اور فوجی افسر بھرتی کرے ۔ مشرق میں یہ عام کمزوری ہے کہ لوگ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ سلطان ٹیپو بھی اس کمزوری کا شکار تھا ۔ ممکن ہے اس کے آدمیوں نے جزیرہ فرانسس میں یہ کہا ہو کہ اگر فرانسیسی سلطان کی اچھی طرح مدد کریں ۔ تو وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا ۔ اس قسم کی باتیں ہندوستان میں عام ہوتی رہیں ۔ ان کو وجہ مخاصمت بنانا اور صلح و جنگ کا موجب ٹھہرانا دور اندیشی سے بعید ہے "

یہی مؤرخ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "ٹیپو اور فرانسیسیوں کا اتحاد انگریزوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی کسی قسم کے خطرے کا موجب بن سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ خطرہ معاہدہ سرنگاپٹم سے لے کر ۲۰ جون ۱۷۹۸ء کے بعد تک قائم رہا ۔ ٹیپو انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان

ایک حدِّ فاصل بنا ہوا تھا۔ اسے مٹانے کے بجائے برقرار رکھنا انگریزوں کے لئے زیادہ مفید تھا۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ٹیپو کا وجود انگریزوں کے لئے کس قدر مفید تھا۔ کیونکہ اس کے فوت ہونے کے تھوڑا عرصہ بعد انگریزوں کو مرہٹوں سے ایک خوفناک جنگ لڑنی پڑی جس میں انھیں بہت سا مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اِن وجوہ کی بنا پر لارڈ مورنگٹن کے اس رویّے کو جو اس نے سلطان ٹیپو کے متعلق اختیار کیا حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

بعض مؤرّخ یہ بھی کہتے ہیں کہ سلطان ٹیپو انگریزوں کو سخت حقارت سے دیکھتا تھا اور وہ انھیں ایک ساعت کے لئے بھی ہندوستان میں دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔ یہ بھی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ چنانچہ سرجان مِلکم سیاسی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:

"لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان سے جو معاہدہ کیا تھا، اسکے بعد ہی سے سلطان کے ہر فعل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برطانوی حکومت سے سخت انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس سے اخلاص پیدا کرنے اور اسے منانے کی جو مسلسل کوشش کی گئی۔ ان سے اس کے انتقامی جذبات میں کمی کی بجائے زیادہ شدّت پیدا ہو گئی۔ اس نے ہمارے خلاف حیدرآباد میں سازشیں کیں۔ پُونا، مارشیس، کابل اور ترکی میں اپنے سفیر روانہ کئے۔ یہ سب اسی مخالفت کے نتائج تھے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت

کا خاتمہ کرنا اس کا خاص مقصد تھا۔ اور وہ ہمیشہ اس پخت و پز میں لگا رہتا تھا۔ اگرچہ اس کے خیالات اور ارادوں کا علم بہت پہلے ہو چکا تھا اور ان سے برطانوی مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی تھا تاہم ویزلی کی آمد سے پہلے اس سے علانیہ مخالفت کی کوئی حرکت سرزد نہ ہوئی۔"

(سیاسی تاریخ ہند۔ جلد اوّل۔ از جان میلکم۔ ص ۲۱۲)

کوئی سلیم الرّائے انسان اس کو وجہ جنگ قرار نہیں دے سکتا۔ یورپ کی موجودہ سیاسی بساط پر نظر ڈالئے۔ کون سی قوم دوسری قوم کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتی ہے؟ کس کا دل دوسرے کے متعلق صاف ہے؟ کیا مسولینی تمام یورپ کو ہڑپ کرنا نہیں چاہتا؟ ہٹلر اتحادیوں سے گزشتہ شکست کا انتقام لینا نہیں چاہتا؟ کیا جاپان پکار پکار کر مغرب کے خلاف حقارت کا اظہار نہیں کر رہا؟ اور کیا روس کے بولشویک تمام دنیا میں اپنا نظام چلانا نہیں چاہتے اور جو ان کے نظام کے خلاف ہے اُسے ملیامیٹ نہیں کرنا چاہتے؟ کیا موجودہ قومیت، امتیاز، رنگ، نسلی تفاوت انسانوں کو انسانوں کا دشمن نہیں بنا رہا؟ کیا آج ہندوستان کو چھوڑ کر باقی تمام دنیا میں ایک قوم دوسری کے خلاف نفرت اور حقارت کے مظاہرے کرتی دکھائی نہیں دیتی؟ تو پھر دنیا میں امن کیوں قائم ہے؟ کیوں ایک قوم دوسری قوم کے خلاف صرف اسی جذبہ کے ماتحت ہتھیار نہیں اٹھاتی! اہلِ برطانیہ کیوں خاموش ہیں؟ جرمنی والے کیوں چپ ہیں۔ فرانسیسی کیوں جارحانہ اقدام

نہیں کرتے ؟ اگر ایسا ہو جائے تو یہی دُنیا جہنّم بن جائے ۔ عافیت اور امن کا خاتمہ ہو جائے ۔ انسان وحشی درندے بن جائیں اور دُنیا عذابِ الیم میں مبتلا ہو جائے ۔

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی مُلک کے واحد مختار یا مطلق العنان بادشاہ کی جانب سے دھمکیوں کا اظہار کبھی جنگ کی صُورت میں منتقل نہیں ہو سکتا ۔ اگر سلطان ٹیپوُ بعض جذبات کے ماتحت اور میسُور کی آزادی کی خاطر کبھی کبھی اس قسم کی دھمکیاں دیا کرتا تھا تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ کمپنی بہادر کے خلاف جارحانہ اقدام کر رہا تھا یا اس کے علاقہ میں وہاں کے نظامِ حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم پھیلا رہا تھا ، یا وہ کسی نہ کسی طرح دکّن کا تمام علاقہ جو کمپنی کے زیرِ نگین تھا ، رفتہ رفتہ سلطنتِ خداداد میں شامل کر رہا تھا ۔ جب ان میں سے ایک بات بھی نہیں تھی تو پھر اسے موردِ الزام ٹھہرانا اور اس کے جارحانہ اقدام کا ڈھنڈورا پیٹنا کیا معنی رکھتا ہے ۔ آؤ ان الزامات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک اصلیت پر مبنی ہیں اور ان میں کتنی صداقت مضمر ہے ۔ موجودہ کتبِ تاریخ کو جانے دیجئے ، کیونکہ ان کی ترتیب و تالیف محض سیاسی اغراض اور مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہوتی ہے اور ان میں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے ۔ اس کے لئے لارڈ مورنگٹن کے مکتوبات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیئے ۔ وہ ماریشس کے گورنر کے اس اعلان کے متعلق جسے مخاصمت کا سنگِ بنیاد قرار دیا جاتا ہے ، جنرل ہیرس کو لکھتا ہوا کہتا ہے :-

"ماریشس میں اہلِ فرانس نے ہمارے خلاف جو اعلان کیا ہے اس سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ مزید احتیاط کے لئے میں اس کی نقل آپ کے پاس روانہ کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اعلان ہمارے اور سلطان کے درمیان سخت گرما گرم بحث کا دروازہ کھول دے گا۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شاید جنگ ہی ہو، اس لئے آپ اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیں"

یہ خط ۹ر جون ۱۷۹۸ء کو لکھا گیا۔ اس کے نفسِ مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ مورنگٹن اسے شدید بحث کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ مگر کیا ایسا ہوا؟ واقعات یہ کہتے ہیں کہ سلطان کو بحث تو درکنار اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ لارڈ مورنگٹن کی نیت کا پتہ اس کے ایک اور مکتوب سے بھی چلتا ہے جو اس نے کمپنی کے ناظموں کے نام ۱۴ر اگست ۱۷۹۸ء کو لکھا تھا۔ اس خط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ لارڈ مورنگٹن اس چیز سے واقف ہے کہ ٹیپو سلطان نے سرنگاپٹم کے معاہدہ کے بعد کمپنی بہادر کو موقعہ نہیں دیا کہ وہ اس سے الجھ سکے۔ مگر اس نے نصف ملک ضائع کرنے، تین کروڑ تیس لاکھ کی رقم کثیر ادا کرنے کے بعد بھی اپنی حالت کو سنبھال لیا اور سلطنتِ خداداد کو قابلِ رشک حالت تک پہنچا دیا۔ اسکی یہ بڑھتی ہوئی ترقی لارڈ مورنگٹن کے اقتدار کے راستے میں ایک زبردست خطرہ تھی۔ اِس لئے اُس نے اِدھر اُدھر کے بہانے پیدا کر کے جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اِس طرح اُس نے ۲۰ر جون ۱۷۹۸ء

کو جنرل ہیرس کو لکھا:۔

"آج میں اپنی اوّلین فرصت میں آپ کو اپنے آخری ارادے سے اطلاع دیتا ہوں اور مزید تاخیر کے بغیر اپنے تمام اتحادیوں کو جمع کرنا چاہتا ہوں۔ نیز ساحل کے ساتھ ساتھ فوج کو بھی اکٹھا کرنا چاہتا ہوں۔ فوج فی الفور ساحل پہ جمع ہو جانی چاہیئے اگر آپ سے ہو سکے تو کسی تیز فہم افسر کو میرے ہاں بھیج دیں جو آپ کی فوج کے متعلق مجھے ہر بات پوری پوری تفصیل کے ساتھ بتا سکے۔ وہ بہتر موسم اور دیگر امور کے متعلق بھی صحیح مشورہ دے سکے جو ٹیپو پر اچانک حملہ کرنے میں مفید ثابت ہو سکیں۔ اس خط کے مضمون کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔"

مگر اتحادی اس وقت جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ نظام کمپنی کے رویّے سے بر داشتہ خاطر ہو چکا تھا۔ کیونکہ ۱۷۹۵ء میں جب مرہٹوں نے اس کے علاقے میں دھاوا بولا تو انگریز چپ چاپ اس کے لٹنے کا تماشہ دیکھتے رہے نظام نے اپنی جاں نثاریوں اور وفاداریوں کا واسطہ دے کر مدد طلب کی اور بار بار کہا کہ معاہدۂ سرنگاپٹم کی رُو سے بھی انگریزوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ میری مدد کریں مگر گورنر جنرل نے کھلے الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ ہم ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں الجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ مرہٹوں نے غلبہ پایا اور نظام کا اقتدار دکن سے اٹھ گیا۔ اسے نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑا۔ واقعات نے

اس کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ اُٹھایا اور اُسے معلوم ہو گیا کہ وُہ کس دھوکے اور سراب میں مبتلا تھا، اس نے انگریزی رسالوں کو حکم دیا کہ وُہ اسکی مملکت سے باہر چلے جائیں۔ ان کی جگہ اس نے اپنی فوجوں میں فرانسیسی بھرتی کیے اور اپنی عسکری قوّت کو بڑھانا شروع کیا۔ برٹش ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل اس حرکت سے گھبرا اُٹھے۔ انھوں نے نظام کو بار بار اس سے روکنے کی کوشش کی، مگر اس نے پروا نہ کی۔ سر جان میلکم ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوُئے کہتا ہے:

"انگریزی امدادی فوج کو برخاست کرنا، اپنی فوج میں اضافہ کرنا، ریزیڈنٹ کی مخالفت اور اعتراض کے باوجود اس کی فوج کے ایک حصّے کو انگریزی سرحد پر متعین کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی دانائی اور جرأت آمیز مسلک سے جو اثر حیدر آباد میں قائم کیا تھا وُہ قطعًا غائب ہو گیا۔ برطانوی حکومت حیدر آباد سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں رکھ سکتی تھی۔ بلکہ بجا طور پر اس بات کا خوف ہو سکتا تھا کہ وہاں کے تمام ذرائع بہت جلد کمپنی کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ یا تو بااثر فرانسیسی جماعت کے ذریعے حیدر آباد کا پورا علاقہ مرہٹوں کے زیرِ اثر ہو گا یا انگریزوں کے جانی دشمن ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں چلا جائے گا، جو اس وقت اپنے مقاصد کے حصول کیلئے سازباز کر رہا ہے۔" (سیاسی تاریخِ ہند جلد اوّل صفحہ ۱۵۱)

کمپنی کی خوش قسمتی سے حیدرآباد میں بعض حالات اس قسم کے پیدا کر دیئے گئے کہ انگریزوں کو ایک مرتبہ پھر حیدرآباد میں رسوخ حاصل کرنے کا موقع مل گیا مگر دلوں میں ابھی تک کدورت بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ جب لارڈ مورنگٹن ہندوستان پہنچا تو کمپنی اور حیدرآباد کے تعلقات بظاہر خوشگوار ہو چکے تھے مگر ان میں گرمجوشی نہ تھی۔ سر جان میلکم کہتا ہے:

"نظام کو مثلِ سابق برطانوی حکومت پر کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اس نے انگریزی حکومت سے اخلاص و اتحاد قائم کرنے کی جو خواہش کی تھی وہ محض فوری فساد اور بغاوت دبانے کے لئے نہ تھی بلکہ اسکا مقصد انگریزوں سے تعلقات بڑھا کر اپنی سلطنت کی فلاح و بہبود اور خوش حالی کا مستقل انتظام کرنا تھا لیکن اسے اس معاملے میں سخت مایوسی ہوئی۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے زبانی وعدوں سے جو امیدیں دلائی تھیں وہ ختم ہو گئیں اور اس نے مجبور ہو کر فرانسیسی جماعت کا اثر قبول کیا۔"

(سیاسی تاریخِ ہند۔ جلد اول صـ۱۸۸)

مگر آصف جاہی دربار میں انگریزوں کا ایک زبردست حامی موجود تھا اور وہ عظیم الامراء تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ٹیپو سلطان کی مخالفت کر کے انگریزی اقتدار اور مفاد کے لئے جگہ بنا رہا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ٹیپو سلطان کی حوصلہ مندیوں کا شکار بننے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ہم ایسی طاقت پہ بھروسہ کریں جس کے قول اور اقرار پر اعتبار ہو سکے۔ موجودہ حالات میں حیدرآباد

کو اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ ایسی سلطنت سے اتحاد قائم کرے جو آڑے وقت میں اس کے کام آسکے۔ اس مقصد کے لئے انگریز سب سے بہتر ہیں کیونکہ باقی تمام (مرہٹہ اور ٹیپو سلطان) ملک گیری کی ہوس میں مبتلا ہیں۔ ان سے اتحاد عارضی ہوگا۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد اپنے قول اور معاہدوں کی پابندی نہیں کریں گے۔ ہمیں اتحاد کا ہاتھ اس جانب بڑھانا چاہیئے جو ہماری حفاظت بھی کرسکے اور امن وامان بھی مہیا کرے۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوا۔ نظام کو ایک مرتبہ پھر سلطنتِ خداداد کا ساتھ چھوڑ کر کمپنی کے ساتھ اتحاد کرنا پڑا۔ اس اتحاد پر ڈیوک آف ولنگٹن اور لارڈ ویلزلی نے بے حد مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔ فرانسیسی فوج کے ترنگے جھنڈے کو تحفۃً انگلستان بھیجا گیا جو اس حکمتِ عملی کی بہترین یادگار تھی جس کی بدولت فرانسیسی اثرورسوخ ہمیشہ کے لئے حیدرآباد سے ختم ہوگیا۔
اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام کو سب سڈی ایری سسٹم کا ایک جزوِ لاینفک بننا پڑا جس کی بدولت کمپنی ہندوستان کی شہنشاہ بن گئی اور تمام راجے اور نواب اس کے باجگزار ہوگئے۔ جہاں تک مرہٹوں کا تعلق تھا وہ باہمی خانہ جنگی اور کمپنی بہادر پر اعتماد نہ رکھنے کی وجہ سے لارڈ مورنگٹن کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکے مگر لارڈ مورنگٹن کی ریشہ دوانیوں سے سلطان ٹیپو کی سفارتیں بھی دربارِ پونا میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس سلسلے میں کرنل پامر ریزیڈنٹ پونا نے بہت کام کیا۔
سب سڈی ایری سسٹم کے ماتحت ایک بہت بڑی فوج تیار کی گئی جس کا

خرچ تمام راجوں مہاراجوں اور نوابوں سے لیا گیا مگر اس کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں دیا گیا اور انگریزوں کے سوا باقی تمام یورپین اقوام کو اپنی فوجوں سے نکال دیا گیا۔

اب اچانک حملہ کرنے کے لئے موقعے کی تلاش شروع ہوئی۔ لارڈ مورنگٹن اسی فرانسیسی خطرے اور گورنر جنرل جزیرہ مورشیس کے اعلان کو جنگ کی وجہ قرار دیتا تھا مگر جنرل ہیرس اور مسٹر ویب سکرٹری گورنمنٹ مدراس اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ جنرل ہیرس نے مندرجہ بالا مکتوب کے جواب میں لکھا کہ:

"مجھے فرانس اور سلطان ٹیپو کے تعلقات کے متعلق کسی قسم کا شک نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ سلطان کی جانب سے ہماری شکایات کا جواب تسلی بخش ہوگا۔ سلطان کے دل میں ہماری نفرت پورے طور پر جاگزین ہے۔ وہ ہر اس موقعے کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھا جو اسے ہمارے ستانے اور تنگ کرنے کے لئے ملے۔ ہندوستان کا سیاسی مطلع ہمارے موافق ہے۔ مگر ابھی تک یہ سوال نہایت سنجیدہ بحث اور متین گفتگو کا محتاج ہے کہ اس زمانے میں جب کہ ہمیں روپیہ کی اشد ضرورت ہے ہندوستان میں جنگ کا دروازہ کھولنا یورپ میں کیا رنگ لائے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شریفانہ طور پر اس کی تلافی کر دی جائے، بشرطیکہ سلطان اس کے لئے تیار ہو۔ بجائے اس کے

کہ ہم سلطان کے گستاخانہ رویّہ کی وجہ سے جنگ
میں کود پڑیں۔"

مسٹر دیبا نے ۶؍جولائی ۱۷۹۶ء کو جو جواب لکھا وہ بھی اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ٹیپو سلطان کے سفیروں کا مورشیس جانا خواہ کسی نیت سے ہو اور یورپ کے سیاسی حالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں، مجھے یہ مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ مورشیس کے فرانسیسی سپاہی یورپ کی جانب روانہ ہو چکے ہیں اور بحری فوج توڑ دی گئی ہے۔ اندریں حالات سلطان اور فرانسیسیوں کا اتحاد ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے جس سے ہم پر یہ الزام عاید ہو کہ پیش قدمی ہماری جانب سے ہوئی۔"

اس مشفقانہ نصیحت کا اثر گورنر جنرل پر کیا ہوا اور اس نے اس پر کہاں تک عمل کیا، اس کا جواب تاریخ کے صفحات سے یہی ملتا ہے کہ لارڈ مورنگٹن جنگ کو ہر حالت میں بہتر سمجھتا تھا۔ وہ سلطان کو ہر طرح تنگ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ غرور اور اقتدار کے نشے نے اسے اس قدر چُور کر رکھا تھا کہ وہ نہ تو کسی کی نصیحت سُننی چاہتا تھا اور نہ کسی کے چلائے چلنا چاہتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے خلاف جذبۂ نفرت نے اس کے کانوں کو ایسا بند کر رکھا تھا کہ حق کی آواز بھی وہاں تک پہنچنی ناممکن ہو گئی تھی

سلطان کے خلاف جذبۂ نفرت کا مزید ثبوت کرنل گوروڈ کے بیان سے بھی ملتا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ:

"وُہ (لارڈ مورنگٹن) اس بات پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا کہ وُہ ذرا سا موقعہ پاکر سلطان ٹیپو کی تمام طاقت کو کچل کر رکھ دے۔ اس کے ساتھ ہی وہ فرانسیسی افسروں کو ہندوستان کی سرزمین سے ایک دم نکال دینا چاہتا تھا۔"

(ولنگٹن ڈسپیچز۔ طبع اوّل، جلد اوّل۔ ص۳۴)

لارڈ مورنگٹن نے اخیر وقت تک سلطان پر اپنا عندیہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وُہ ہر طرح اُسے اپنی دوستی کا یقین دلاتا رہا۔ اس کی ابتدائی تحریروں میں درشتی نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ کچھ عرصے سے کمپنی اور سلطان ٹیپو کے درمیان وائیناڈ کے علاقہ کے متعلق تنازعہ چلا آتا تھا اور یہ تنازعہ خواہ مخواہ طوالت پکڑ رہا تھا۔ لارڈ مورنگٹن نے اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی ایک کمیشن کے ذریعے اس کا فیصلہ بھی سلطان کے حق میں کرا دیا۔ سلطان کے جذباتِ شکر گزاری اس منصفانہ فیصلے سے اُبل پڑے اور اس نے لارڈ مورنگٹن کو ایک مکتوب میں اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہوئے لکھا کہ:

"مفسدہ پرور لوگ اس دُھن میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ہم میں پھوٹ پڑ جائے مگر خدا کے فضل و کرم سے مجھے اُمید ہے کہ دوستی اور محبّت کا یہ سرچشمہ ختم نہ ہوگا۔"

سُلطان کی یہ سادہ دِلی قابلِ رحم تھی۔ اُسے علم نہ تھا کہ لارڈ مورنگٹن جیسے

وہ اپنا محسن تصور کر رہا ہے، اسے مٹانے کے لئے خفیہ طور کیا کیا تیاریاں کر رہا ہے۔ اس کی دوستی کا دعویٰ اور اس کا منصفانہ رویہ درحقیقت وقت گزارنے کا بہانہ اور سلطان کو اپنے دلی ارادے سے بے خبر رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔

سلطان کے اس مکتوب کا جواب غیر متوقع طور پر تعویق میں ڈال دیا گیا۔ لارڈ مورنگٹن نظام حیدر آباد کو اپنے ساتھ ملانے میں مشغول رہا۔ جب یورپ سے امید افزا خبریں آنے لگیں اور ہندوستان سے فرانسیسی ہوا دور ہو گیا تو لارڈ مورنگٹن نے اکتوبر ۱۷۹۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا:۔

"مجھے یقین کامل ہے کہ اب سلطان ہم پر حملہ کرنے میں کسی قسم کی جسارت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کی طرف سے پیش قدمی ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسے فرانس سے مستعد امداد نہیں مل سکتی، مجھے یہ بھی امید ہے کہ انگریزی بیڑا اہلِ فرانس کو اُدھر نہیں آنے دے گا۔ بایں ہمہ مجھے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جنگی تیاری کے لئے مؤثر سرگرمی کا اظہار کیا جائے۔"

گورنر جنرل کا یہ مکتوب اور اس وقت کے سیاسی حالات ہمارے سامنے ہیں۔ دونوں کا توازن کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت جنگ و جدل کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ طوبون کے مقام پر فرانسیسیوں کا بیڑا بُری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ لارڈ مورنگٹن نے اس مسرت بخش واقعے کی اطلاع سلطان کو پہنچاتے

ہوئے ۴ر نومبر ۱۷۹۶ء کو لکھا کہ:

"اس اتحاد اور یک جہتی پر اعتماد کرتے ہوئے جو دونوں سلطنتوں میں ہے یہ خبر آپ کے اطمینانِ خاطر اور دلی مسرت کا باعث ہوگی اور میں اسے آپ تک پہنچانے میں خاص خوشی محسوس کرتا ہوں۔"

اس تعویق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت شمالی ہندوستان انگریزوں کے لئے اُمید و بیم کا ایک بہت بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ زمان شاہ والئی افغانستان کے حملے کی افواہوں نے مرہٹوں اور انگریزوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ لارڈ مورنگٹن اس سلسلے میں بے حد مضطرب تھا۔ وہ ایک طرف تو ہندوستان کی منتشر قوتوں کو کمپنی کے جھنڈے تلے جمع کر رہا تھا تاکہ زمان شاہ کے حملے کے موقعے پر وہ ہندوستان کو اس کی دست برد سے بچا سکے۔ دوسری طرف وہ یہ چاہتا تھا کہ افغانستان میں اس قسم کی اُلجھنیں پیدا کر دی جائیں کہ زمان شاہ ہندوستان کا رُخ نہ کر سکے۔ اور وہ اپنے گھر ہی کی مشکلات میں مبتلا ہو کر رہ جائے۔ اس مقصد کے لئے اسے ہندوستان سے ایک شخص مل گیا جس کی سفارش لارڈ ڈنکن گورنر بمبئی نے کی اور لکھا کہ یہ شخص ہمارے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ کمپنی کا یہ ایجنٹ ایک ہندوستانی شیعہ مُسلمان مہدی علی خان تھا۔ وہ گورنر بمبئی کے حکم سے بوشہر گیا اور ایرانی رعایا بن گیا۔ یہاں بیٹھ کر اس نے ایرانی اور افغانی اُمراء میں اپنا اثر اور رسوخ بڑھانا شروع کیا، اس نے شیعہ سُنّی اختلافات کی داستانیں بڑی آب و تاب سے بیان کیں۔ سائکس کہتا ہے کہ:-

"اس نے ایرانی دربار کو اس بات کا یقین دلایا کہ افغان ہندوستان کے شیعوں پر جاں گسل مظالم توڑ رہے ہیں۔ لاہور کے شیعوں پر تو عرصۂ حیات اس قدر تنگ ہو چکا ہے کہ وہ بھاگ بھاگ کر کمپنی بہادر کے علاقے میں پناہ لے رہے ہیں۔ زمان شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے سے روکنا انسانیت اور مذہب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔"
(تاریخِ ایران جلد دوم از سائکس ص۲۹۷)

اس کے اس پروپیگنڈے کا حسبِ دلخواہ اثر ہوا۔ ایرانی امیر بھڑک اُٹھے۔ اُنھوں نے شاہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ مہدی علی نے اس موقعے پر سونے اور چاندی کا مینہ برسایا اور بڑی بڑی رشوتیں دے کر ہوا کا رُخ افغانستان کے خلاف کر دیا۔

زمان شاہ کا ایک بھائی محمود خان بھی تھا۔ اس کی اور زمان شاہ کی آپس میں نہ بنتی تھی۔ ایرانی امیروں نے شاہ کو ورغلایا کہ وہ شیعہ لوگوں کے بچاؤ کے لئے محمود خان کی مدد کرے تاکہ وہ زمان شاہ کے خلاف جنگ کر کے شیعوں کو اس عذابِ الیم سے بچا لے۔

زمان شاہ نے ۱۷۹۸ء کے آخر میں ایک زبردست لشکر مرتب کیا اور ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ حملہ سیاسی طور پر بے حد اہم تھا۔ ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور وقار کی زندگی اور موت کا سوال اس سے وابستہ تھا۔ تیموری اپنی کھوئی ہوئی شوکت اور آزادی اسی حملے کی کامیابی سے حاصل کر سکتے تھے۔ مرہٹوں کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی سے رُک سکتا تھا۔ اودھ والوں کے ساتھ

جو مسلسل بے انصافیاں ہو رہی تھیں۔ ان کا ازالہ بھی اسی سے ہو سکتا تھا۔ نواب وزیر علی بڑے اضطراب اور پریشانی کے ساتھ اس حملے کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ دکن کی تمام سیاسی مصیبتوں کا خاتمہ اور ٹیپو سلطان کے پروگرام کی تکمیل بھی اسی پر منحصر تھی۔ مگر واقعات نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ ابھی زمان شاہ لاہور ہی پہنچا تھا کہ اسکے بھائی محمود خان نے ایرانی فوجوں کی مدد سے ہرات پر حملہ کر دیا۔ اس وحشت انگیز خبر نے زمان شاہ کو مجبور کیا کہ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ واپس لوٹے اور گھر کو سنبھالے۔ زمان شاہ واپس چلا گیا اور پہلی ہی جنگ میں اپنے بھائی کے ہاتھوں شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور اسے زندگی کے بقیہ ایام نہایت غربت اور افلاس کی حالت میں گزارنے کے لئے لدھیانہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے لارڈ مورنگٹن، لارڈ ڈنڈس کو لکھتا ہے :۔

"زمان شاہ ۴ جنوری ۱۷۹۹ء کو لاہور سے واپس چلا گیا۔ اس کی مراجعت کی بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا بھائی محمود خان اچانک بلخ کی سرحد پر نمودار ہو گیا۔ تاریخوں کے مقابلے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ محمود کی یہ نقل و حرکت آپ کے ایجنٹ مہدی علی خان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ کو مہدی علی خان کی قابلیت اور صلاحیت کا پورا پورا اطمینان ہو تو اسے دو لاکھ دس ہزار روپیہ کی رقم معاوضے کے طور پر دینا کوئی زیادہ رقم نہیں ہے۔"

(ڈسپیچز آف ولزلی جلد اوّل ص۴۴۳)

اِس طرح ہندوستان کا سیاسی مطلع بالکل صاف ہو گیا اور افغانستان کی وہ پُرجلال شخصیت جس کے نام سے ہندوستان کی تمام طاقتیں کانپتی تھیں ایک مسلمان کی غداری کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

جب لارڈ مورنگٹن نے دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ دشمنوں کی طاقت مٹیامیٹ ہو چکی ہے اور ان کی فوجیں ہر مقام پر پسپا ہو رہی ہیں تو اس نے دو عملی کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اصلی روپ میں ظاہر کیا اور اپنے ۴ر نومبر کے خط کے چار ہی دِن بعد ۸ر نومبر ۱۷۹۸ء کو سُلطان ٹیپُو کے نام تحکمانہ لہجے میں گستاخانہ مکتوب لکھا جس میں اسے دھمکی دیتے ہوئے بتایا کہ:

"آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ میں اس خط و کتابت سے ناواقف ہوں جو آپ کے اور کمپنی بہادر کے دشمن فرانسیسیوں کے درمیان ہو رہی ہے۔"

اس مکتوب میں اتحاد۔ دوستی اور یک جہتی کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتے ہوئے لارڈ موصوف نے لکھا کہ:

"حالات کی تحقیق کے لئے میجر ڈاؤٹن کو روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسے اس امر کی ہدایت کر دی گئی ہے کہ کمپنی کے حقوق کے تحفظ اور قیام امن کے لئے وہ جو علاقہ چاہے سلطان سے طلب کر لے۔"

مؤرخ کہتے ہیں اور لارڈ مورنگٹن کے مکتوبات سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کمپنی بہادر کی نظر سلطنتِ میسُور کے ساحلی علاقہ پر تھی جس سے

غرض یہ تھی کہ سلطان ٹیپو کا تعلق ساحلِ سمندر سے بالکل منقطع ہو جائے۔

اس مکتوب کا جواب ابھی موصول نہیں ہوا تھا کہ گورنر جنرل نے تمام افواج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ۱۳؍ دسمبر ۱۷۹۸ء کو امیر البحر رینئر کے نام مکتوب پہنچا کہ:

"دکن میں فرانسیسی جماعت کی تباہی، ساحل کارومنڈل اور مالابار پر جنگی تیاریوں میں ہماری پیش قدمی اور یورپ اور راس امید سے بہت بڑی کمک کی توقع نے ہماری حالت اس جزیرہ نما میں بہت ہی مضبوط اور مستحکم بنا دی ہے۔ ٹیپو سلطان کے معاندانہ رویّے کی واقعیت نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں اور اس کی جنگی طاقت کو توڑ یا اسلحہ کے استعمال سے کچل کر رکھ دوں۔"

حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ انصاف پسندی سے کام لیجئے۔ خدا لگتی کہیئے کہ سلطان ٹیپو پر حملہ کرنے میں لارڈ مورنگٹن کہاں تک حق بجانب تھا، کیا جنگ ضروری تھی اور کیا حالات اس کے بغیر درست نہیں ہو سکتے تھے؟

اس خط کے بعد لارڈ مورنگٹن نے کلکتہ کو چھوڑ کر مدراس کا رُخ کیا۔ جب دسمبر کے آخر میں وہ مدراس پہنچا تو سلطان کا جواب موصول ہو چکا تھا۔ اس مکتوب میں گورنر جنرل کے تمام الزامات کا جواب دیتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ:

"اہلِ فرانس مجسّم شیطانیت ہیں۔ انھوں نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا ہے اور زیرِ بحث اعلان اس لئے شائع کیا ہے کہ دونوں سلطنتوں کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔"

ڈاؤنن کمیشن کے متعلّق سلطان نے لکھا کہ:

"صُلح کی انجام دہی کے وقت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ یہ معاہدہ جو چار سلطنتوں (حیدرآباد۔ مرہٹہ۔ کمپنی بہادر اور میسور) کے درمیان ہو رہا ہے، ایک مستقل چیز ہو گی اور اس میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں ہو سکے گا۔ یہ معاہدہ اس وقت کے حکمرانوں کے لئے ایک نمونہ ثابت ہو گا۔ اور کسی کو اس میں تغیّر و تبدل کا حق نہ ہو گا۔ صُلح و صفائی قائم رکھنے کے لئے اس سے مؤثّر ذرائع اور کیا ہو سکتے ہیں؟"

بعض مؤرّخ یہ کہتے ہیں کہ اس وقت سلطان ٹیپو دورُخی پالیسی سے کام لے رہا تھا مگر میجر باسو کا خیال ہے کہ "ایک پکّا مسلمان خدا کا نام درمیان میں لا کر کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ ہی دورُخی چالیں چل سکتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا تعالےٰ سے بڑھ کر کوئی مقدّس اور پاک ذات نہیں ہوتی۔ اس لئے وُہ کِذب اور ریاکاری سے اجتناب کرتا ہے۔" وہ اپنے قول کی تائید میں جیمز ملز کا یہ بیان پیش کرتا ہے کہ:

"ٹیپو کی زندگی کا سب سے اہم پہلو مذہب سے دِلی لگاؤ تھا۔ وُہ

حقیقی معنوں میں خدا پرست تھا۔ اس کے وقت کا بیشتر حصّہ عبادات میں صرف ہوتا تھا اور اسی مذہبی جوش کی بنا پر اس نے اپنی سلطنت کا نام "سلطنتِ خداداد" رکھا تھا۔ وہ ہر کام میں خدا پر بھروسا کرتا تھا اور یہی بات اس کی تباہی کا باعث ثابت ہوئی۔ کیونکہ اسی جذبے کے ماتحت وہ کسی قسم کی تیاری نہ کر سکا۔"

ٹیپو کے متذکرہ بالا مکتوب سے گورنر جنرل کی تسلّی نہ ہوئی۔ اس نے ایک اور مکتوب لکھا اور اس کا جواب چوبیس گھنٹے کے اندر طلب کیا۔ اس مکتوب کے آخری الفاظ تھے کہ:

"میری دِلی خواہش ہے کہ مکتوب پہنچنے پر آپ جواب دینے میں ایک دن سے زیادہ تاخیر نہ کریں۔ ان اہم معاملات میں تاخیر خوفناک نتائج کی ذمّہ دار ہو گی۔"

یہ مکتوب خوفناک جنگ کا پیش خیمہ تھا۔ مگر گورنر جنرل نے ٹیپو سلطان کو بھلاوا دینے کے لئے ایک اور مکتوب لکھا اور اس کے ساتھ خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم ثالث والئ روم کا ایک سفارشی خط بھی روانہ کیا جو مسٹر اسپنسر برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کی وساطت سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے کہ فرانسیسی بڑے غدّار اور بے دین ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انگریز ہمارے دوست اور حلیف ہیں۔ اس لئے فرانسیسیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھو اور انگریزوں سے صُلح کر لو!

اس مکتوب کو روانہ کرتے ہوئے گورنر جنرل نے اپنی جانب سے لکھا کہ:

"آپ کے لئے بہتر ہے کہ تمام مذاہب کے دشمن اور خلیفۂ اسلام پر حملہ کرنے والے فرانسیسیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے جوشِ اسلامی دکھائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جب آپ نامۂ سلطانی کو پڑھیں گے تو آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ فرانسیسیوں نے مسلمانوں کے خلیفہ کی توہین کی ہے اور اس پر حملہ کیا ہے اور بے وجہ مصر و شام میں جارحانہ جنگ شروع کر دی ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جن کی ہر مسلمان عزت کرتا ہے اور جنھیں مذہبِ اسلام کی یادگاروں کا خزینہ سمجھتا ہے۔"

ٹیپو سلطان نے اس کے جواب میں خلیفہ کو ایک طویل مکتوب روانہ کیا۔ جس میں لکھا کہ:

"نامۂ عالی نہایت اچھے وقت میں پہنچا اور اس کے مضامین سے آگاہی ہوئی جس میں کہ فرانسیسی قوم کی بُرائیاں اور اہلِ اسلام کے ساتھ ان کی دشمنی اور ان کا یہ ارادہ کہ دُنیا سے تمام مذاہب کو اکھاڑ پھینکیں اور انگریزوں کی حمایت اور جناب عالی کا یہ عزم کہ حضور خود بیچ میں پڑ کر صلح کرا دیں اور یہ حکم کہ جو وجوہِ مخالفت ہیں ان کو ہم بیان کریں، مندرج تھا۔ آستانۂ والا پر مخفی نہیں کہ ہماری غرض خدا کے راستے میں جہاد اور دینِ الٰہی کے سررشتۂ امور کو درست کرنا ہے۔ یہ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ فرانسیسی قوم میں وفا شعاری نہیں اور

ہم ان کی بُرائیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج کل انگریز ہم سے لڑنے آئے ہیں اور انھوں نے سامانِ جنگ تیار کیا ہے۔ اس بنا پر ہم پر بلکہ تمام مسلمانوں پر ان سے جہاد فرض ہے۔ استانۂ والا سے اُمید ہے کہ خاص اوقات میں ہمارے لئے دُعا فرمائیں اور اپنی دُعا اور محبّت سے ہماری مدد فرمائیں۔ اسی کی جناب سے درخواست ہے اور خدا ہمارے اور آپ کے لئے کافی ہے۔"

ٹیپو سُلطان اس وقت عجیب مخمصے میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ نہ تو جنگ کے لئے تیار تھا نہ گورنر جنرل کی شرائط مان کر اپنی خودداری، حمیّت اور غیرت کو ٹھیس لگا سکتا تھا۔ اُس نے مکتوب کا جواب نہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ فروری کو گورنر جنرل نے تمام افواج کو نقل و حرکت کا حکم دے دیا۔ فوجیں ہر جانب سے سلطان کے علاقہ کی طرف بڑھیں۔ سلطان نے جب تباہی کے بادل اپنے سر پر منڈلاتے دیکھے تو ۱۳ فروری ۱۷۹۹ء کو گورنر جنرل کے نام مکتوب روانہ کیا جس میں لکھا کہ وہ میجر ڈاوٹن کو بھیج سکتا ہے۔ مگر گورنر جنرل نے ٹیپو کی اس پیشکش کو لاپروائی کی ٹھوکر سے ٹھکرا دیا اور ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء کو سلطان کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا۔

اس مہم کے لئے جنرل ہیرس سپہ سالار مقرر ہوا اور اُس کی مدد کیلئے سر جان ملکم، آنریبل سر آرتھر ویلزلی اور کیپٹن میکالے جیسے سیاسی مفکر اس کے ہمراہ کر دیئے گئے۔

یہ جنگ فوجوں اور سپاہیوں کی شرمندۂ احسان نہیں اور نہ ہی اس میں تلواروں کی چمک، توپوں کی گرج، بارود کی آتشبازی اور بندوقوں کی باڑ نے کچھ کام کیا بلکہ سلطنتِ خداداد کے اُمراء کی غداری، وُزرا کی نمک حرامی اور مطلب پرست خود غرض لوگوں کی دغابازی کمپنی کی تمام کامیابی کی ذمّہ دار تھی۔ چنانچہ میجر باسو اپنی مشہور کتاب "ہندوستان میں عیسائی طاقت کا عروج" میں لکھتا ہے کہ "گزشتہ جنگ میں بھی لارڈ کارنوالس کو کامیابی اسی سازش اور غداری کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی اور اس دُوسری جنگ میں بھی اس کا صاف اور عریاں ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو گورنر مدراس نے لارڈ مورنگٹن کے نام ۲۹ر نومبر ۱۷۹۸ء کو لکھا۔ مکتوب کے الفاظ یہ ہیں:

"میں آپ کی خاص توجہ کے لئے ایک تحریر روانہ کرتا ہوں جس کی حقیقت اور صداقت پر ہر طرح یقینِ کامل ہے۔ یہ تحریر ایک ایسے شخص کی ہے جو میسُور کے معزول شدہ خاندان سے بے تکلفانہ تعلقات اور گہری دوستی رکھتا تھا اور جس کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاعات گزشتہ جنگ میں نہایت کارآمد، اہم اور صحیح ثابت ہوتی تھیں۔ ترمل راؤ کے تعلقات میسُور کی سال خوردہ رانی سے بہت اچھے ہیں۔ وہ آجکل ٹیپو سلطان کی حراست میں ہے۔ اس کی تمام اُمیدیں اس جنگ سے وابستہ ہیں۔ اس بدنصیب عورت کے خیالات اور ارادوں سے میں عنقریب آپ کو اطلاع دوں گا۔ وہ تحریر آپ کے کامل غور اور فکر کے قابل ہو گی۔

ترلی راؤ کے تعلقات اور لوگوں سے بھی ہیں جو سلطان کے مقرب ہیں۔"

لارڈ مورنگٹن کے ایک مکتوب سے بھی اس قسم کی سازش کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مکتوب جنرل ہیرس کے نام ہے۔ لارڈ مورنگٹن لکھتا ہے :

"مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے اور اس علم کی بنا پر میں نہایت یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُمراء، وُزراء، باجگزار اور رعایا سلطان کے خلاف ہے اور وُہ ہمارے زیرسایہ آنے کے لئے تیار ہے۔ اب جبکہ ہمیں سلطان کی سختی اور بدعہدی کی وجہ سے جنگ اختیار کرنی پڑی ہے تو یہ عین انصاف ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہم رعایا کی اس پریشان حالی، بے اطمینانی اور ناراضگی سے فائدہ اٹھائیں۔ چونکہ آپ کے ذمّے نہایت اہم فرائض ہیں اور آپ اس کارروائی میں زیادہ حِصّہ نہیں لے سکتے اس لئے میں اس کام کے لئے کرنل کلوز، انریبل کرنل ادٰنھر ویلزلی، لیفٹیننٹ کرنل کلوز، لیفٹیننٹ کرنل آگنیو، کپتان مالکم، کپتان میکالے کو تجویز کرتا ہوں۔" (ڈسپیچز آف ویلزلی۔ جلد اوّل ص ۴۴۲)

۳۷ ہزار کے قریب فوج جو پیدل، سوار اور توپ خانہ وغیرہ پر مشتمل تھی اور جس میں انگریزوں کے علاوہ نظام کے آدمی بھی شامل تھے، ٹیپو سلطان کی سرکوبی کے لئے متعین کی گئی۔ نظام کی فوج میر عالم کی کمان میں اور بمبئی کی فوج جنرل اسٹوارٹ کی کمان میں تھی۔ ان سب کا سپہ سالار جنرل ہیرس تھا۔ اسکے

اختیارات بہت وسیع تھے۔ کسی سول یا فوجی افسر کو اس کے حکم کے خلاف چوں و چرا کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انگریزی فوج دو جانب سے سلطنتِ خداداد پر حملہ آور ہوئی۔ فوج کا ایک حصہ مالابار اور کورگ کے راستے اور دوسرا مدراس کی جانب سے سرنگاپٹم کی جانب بڑھا۔ ٹیپو کو جب اس یورش کا علم ہوا تو وہ تھوڑی سی فوج لے کر جنرل اسٹوارٹ کو روکنے کے لئے سدامیر تک آیا۔ غنیم سے اس کی جھڑپ ہوئی اور جب اسے یہ علم ہوا کہ برطانوی فوج سلطنتِ خداداد کی دوسری جانب دباؤ ڈال رہی ہے تو وہ اس حملہ کو ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوجیں بڑھتی بڑھتی سرنگاپٹم کے پاس پہنچ گئیں۔ کیونکہ میر معین الدین اور پورنیا سلطان سے غداری کر رہے تھے اور جان بوجھ کر اس کی فوج کو انگریزی توپ خانہ کی زد میں لا کر تباہ کروا رہے تھے۔ اسی اثناء میں سلطان کا ایک وفادار افسر نواب محمد رضا خان مارا گیا۔ اب دشمن نے سرنگاپٹم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سلطان کی ہر نقل و حرکت کی خبر میر صادق، پورنیا اور میر معین الدین کی معرفت انگریزی کیمپ میں پہنچ رہی تھی، اور اس لئے وہ مطمئن تھے اور رفتہ رفتہ سرنگاپٹم کے اطراف میں ضروری اور اہم مقامات پر قابض ہو رہے تھے۔ ان کی گولہ باری نے قلعہ کی دیواروں کو چھلنی کر دیا۔ سلطان کو اب حالات کا علم ہوا اور وہ سمجھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان امیروں کی غداری کی وجہ سے ہے۔ اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو اس نے خاکِ مذلت سے اٹھا کر بامِ ترقی پر پہنچایا تھا۔ سلطان ان مایوس کن حالات سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔ اس نے اپنے

چند وفادار فرانسیسی افسروں کو جو سالہا سال سے اُس کے پاس ملازم تھے، اپنے حضور میں طلب کیا اور صورتِ حالات کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"موجودہ حالات کو تم دیکھ رہے ہو، کوئی قابلِ اطمینان بات باقی نہیں رہی۔ جن لوگوں کو میں اپنا اعتباری اور وفادار تصوّر کرتا تھا، اب اِن آنکھوں سے اُن کی بے وفائی، مکّاری اور غدّاری کے مناظر دیکھ رہا ہوں۔ دُشمن زوروں پر ہیں۔ ان کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اَب کیا کرنا چاہیئے؟"

فرانسیسی افسروں نے تسلیمات بجا لاتے ہوئے عرض کیا:

"اعلیٰ حضرت ہمارے ولی نعمت ہیں۔ ہم نے حضور کا نمک کھایا ہے۔ یہ آپ کی عین عنایت تھی کہ آپ نے ہم پر اعتماد کیا۔ ہم وفادار ہیں۔ جہاں حضور کا پسینہ گرے گا، ہم وہاں اپنا خُون گرائیں گے۔ اگر حضور ہماری رائے کو پسند فرمائیں تو جواہرات کی پیٹیاں، اشرفیوں کے صندُوق، توشہ خانہ کا قیمتی سامان لے کر حرم سرا کی خواتین کے ساتھ رات کی خاموشی میں قلعۂ معلّےٰ سے باہر تشریف لے جائیں اور دس۱۰ ہزار سوار، پانچ۵ ہزار باقاعدہ پیادہ فوج اور بیس۲۰ ضرب توپ لے کر ڈبل کُوچ کے ساتھ قلعۂ چلدرگ چلے جائیں۔ اپنے معتمد اور وفادار افسروں اور جانثار سرداروں کو مختلف کاموں پر مامُور فرما جائیں۔ یہ قلعہ ہمارے سپُرد کریں۔ جب تک ہم میں سے

ایک متنفس بھی باقی رہے گا، دشمن قلعہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اگر آپ اس بات کو پسند نہ فرمائیں تو ہم سب فرانسیسیوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہے اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو مصالحت کا ہاتھ آپ کی جانب بڑھائیں گے۔ پرخاش اور جنگ و جدل کے بادل چھٹ جائیں گے۔ امن اور آشتی کا نیرِ عالمتاب نکل آئے گا اور یہ خرخشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔"

سلطان پر اس تقریر کا بہت اثر ہوا۔ اس نے ان کی بہادری، نمک حلالی اور وفاداری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں اپنے دوستوں کو دشمنوں کے حوالے کر دوں۔ خواہ میری سلطنت ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔

اس کے بعد سلطان نے اپنے نمک حرام دیوان میر صادق کی جانب رُخ کیا اور اُس کی رائے پوچھی۔ اُس نے سخن سازی کرتے ہوئے بڑے ہمدردانہ لہجے میں سلطان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا کہ فرانسیسی اور انگریز ایک ہیں۔ جونہی آپ نے قلعہ کے باہر قدم رکھا یہ انگریزوں کو اس کی اطلاع پہنچائیں گے۔ اس بات کی تائید پورنیا نے بھی کی۔

اسی اثنار میں سلطان نے ایک مرتبہ پھر صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کی مگر صلح کے لئے جو شرائط پیش کی گئیں وہ سخت ذلیل کُن اور توہین آمیز تھیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ تمام ساحلی علاقہ اور سلطنتِ خداداد کا نصف

حصّہ کمپنی بہادر کے حوالے کر دیا جائے۔
دُوسری شرط یہ تھی کہ بیس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ کے طور پر ادا کئے جائیں
تیسری شرط یہ تھی کہ سُلطان اپنے چار بیٹے اور چار معتمد امیر یرغمال کے طور پر کمپنی کے سپرد کر دے اور سُلطان آئندہ کیلئے کمپنی کا باجگزار بن کر رہے
ان تمام شرائط پر غور کرنے کے لئے اُسے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی گئی۔
ولکس کہتا ہے کہ :۔

”وہ ان شرائط کی سختی اور بے انصافی سے بہت برافروختہ ہوا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک سپاہی کی طرح لڑتا ہوا میدانِ جنگ میں مارا جائے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کافروں کے رحم پر اپنے آپ کو چھوڑ دے اور دیگر وظیفہ خوار نوابوں اور راجوں کی طرح زندگی بسر کرے۔“

(ولکس۔ جنگِ میسور جلد سوم۔ صفحہ ۲۸۔ ۴۲۷)

اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ سُلطان نے بعض معتمد امیروں کو بلا کر ان کے سامنے قلعہ سے نکل جانے کی تجویز پیش کی مگر بدر الزمان خاں نائطہ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے نکل بھاگنے سے تمام کام بگڑ جائیگا۔ قلعہ غنیم کے قبضے میں آجائے گا۔ اب لڑنا ہی بہتر ہے۔ ان امیروں کی باتوں سے سلطان پر یہ بات اچھی طرح منکشف ہوگئی کہ یہ نمک حرام امیر اسے تباہ کرا کے دشمنوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔
جنگ کے لئے تیاریاں شروع ہوئیں۔ سلطان دیکھ رہا تھا کہ تمام اہم مقامات پر افسروں کو متعین کرنے کے باوجود غنیم کے قدم آگے بڑھتے چلے آتے ہیں

انگریزی فوج کو سامانِ رسد بڑی کثرت سے ساتھ میسر آ رہا ہے۔ حالانکہ اُس نے اپنے امیروں کو ایک زبردست دستہ دے کر سامان رسد روکنے کے لئے متعیّن کر رکھا تھا۔ سلطان غداری کے یہ مناظر دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھ رہا تھا۔ امیروں کی غدّاری اس حد تک بڑھ گئی کہ انگریزی افسر قلعے میں آتے اور جاتے رہے۔ چنانچہ کرنل بٹس کا بیان ہے کہ ۳۰ اپریل اور ۲ مئی کی شب کو لیفٹیننٹ ہل اور لیفٹیننٹ لارنس خندق کو عبور کر کے قلعے میں آئے اور تمام حالات کا جائزہ لے کر واپس چلے گئے۔

اس سے بڑھ کر اور غدّاری کیا ہو سکتی ہے کہ قلعے کی خندق میں پانی پایاب رکھا گیا اور سپاہیوں کو مورچوں کی حفاظت کے بجائے دیگر غیر ضروری کاموں میں لگا دیا گیا۔

آخر وُہ دن آ پہنچا جس کا غدار امیر بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ ۴ مئی کو علی الصبح سلطان نے درود و وظائف سے فارغ ہو کر قلعے کا جائزہ لیا۔ دس بجے کے قریب نجومیوں کی ایک جماعت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ آج کا دن آپ کے لئے سخت منحوس ہے، کچھ صدقہ ہونا چاہیئے۔ سلطان نے ان کے کہنے کے بموجب غسل کیا۔ ایک سیاہ ہاتھی جس پر مخمل کی جھول پڑی ہوئی تھی۔ اور جھول میں موتیوں کی جھالریں تھیں، فقیروں اور درویشوں کو بخش دیا۔ ایسا کرنے کے بعد سلطان قلعے کی شمالی فصیل کی طرف آیا جو شکستہ ہو چکی تھی اور دوپہر تک اس کی مرمت وغیرہ دیکھتا رہا۔ جب تھک گیا تو ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ یہیں اس نے خاصہ طلب کیا۔ ابھی اس نے ایک نوالہ ہی اٹھایا تھا کہ رونے اور چلانے کی آواز بلند ہوئی، واویلا کا شور و غوغا اُٹھا اور چند جان نثار یہ خبر لائے کہ سید غفّار حضور پر نثار ہو گیا ہے۔

سلطان نے اس لُقمے کو وہیں چھوڑا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ اب ہمارا آفتابِ اقبال بھی غروب ہونے والا ہے۔ اتنا کہتے ہوئے وہ تلوار ٹیک کر اُٹھا۔ بندوق ہاتھ میں لے اسلحہ سنبھال چھوٹے دروازے سے یہ کہتا ہوا نکلا:؎

نہیں چاہتا تاج اور تخت اب
شہادت کا پیاسا ہوں اب تشنہ لب
(بہادر نامہ)

سیّد غفار سلطان کا ایک بہت ہی وفادار فوجی افسر تھا۔ تمام سرنگاپٹم میں یہی ایک فوجی افسر تھا جس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ سلطان کو ہمیشہ درست اور صحیح مشورہ دیا کرتا تھا۔ سلطان اسکا بے حد احترام کرتا تھا۔

اب تک میسوری فوج بڑی مستعدی اور سرگرمی سے لڑ رہی تھی اور دشمن کو بھی یہ نظر آ رہا تھا کہ سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر نمک حرام پورنیا نے ان تمام مشکلات کو ایک معمولی سی حرکت سے آسان کر دیا۔ عین اس وقت جبکہ معرکہ جدال و قتال گرم تھا۔ دھواں دھار گولے برس رہے تھے۔ بندوقوں کی گولیاں سنسنا رہی تھیں۔ جوانمرد سر دست دے کر سُرخرُو ہو رہے تھے۔ پورنیا نے حکم دیا کہ سپاہی آئیں اور اپنی تنخواہ لے جائیں۔ درحقیقت وہ فوج کو مورچے سے ہٹا کر غنیم کو یہ موقعہ دینا چاہتا تھا کہ وہ قلعے پر چڑھ آئیں۔ سپاہی یہ حکم پاکر مسجدِ اعلےٰ کے پاس تنخواہ لینے چلے گئے اور اُدھر سفید نشان اڑا کر غنیم کو خبر دے دی گئی کہ میدان صاف ہے۔ تمام رکاوٹیں ہٹ گئی ہیں، بڑھتے چلے آؤ موقعہ غنیمت ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جنرل میڈو اس بیان کی تائید کرتا ہوا لکھتا ہے کہ:

"جنرل بیرڈ انگریزی فوج لے کر خندقوں سے باہر نکلا اور دریا عبور

کر کے قلعہ کی فصیل کے پاس پہنچا۔ اس کی راہ نمائی میر قاسم علی کر رہا
تھا اور وہی سب سے اوّل قلعے کی فصیل پر چڑھا۔"

سلطان اپنے ذاتی محافظ ساتھ لے کر علم بیرّی کی طرف بڑھا مگر انگریزی فوج فصیل پر قابض ہو کر قلعے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ دیکھ کر سلطان واپس آیا تاکہ قلعے میں داخل ہو جائے مگر دروازہ کو بند پایا۔ یہ کارروائی میر صادق کی تھی۔ سلطان اب سوچنے لگا کہ کیا کرے! اسی اثنا میں انگریزی فوج وہاں آ پہنچی۔ ایک امیر نے کہا۔ کہ آپ اپنے آپ کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔ سلطان یہ سُن کر سخت طیش میں آیا اور بولا:

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دِن کی زندگی بہتر ہے۔"

اب دھر ادھر بندوقیں چلنے لگیں۔ گھمسان کا رَن پڑا اور کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ اسی دارو گیر میں ایک گولی سلطان کے گھوڑے کو لگی۔ سلطان پا پیادہ ہو کر لڑنے لگا۔ جان نثار سپاہی چاروں طرف سے پروانہ وار اپنے آپ کو سلطان پر قربان کر رہے تھے۔ انگریزی فوج کا زور بھی اسی مقام پر تھا۔ سلطان ایک تنگ جگہ میں گھِر گیا۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ عین اس ہنگامے میں ایک گولی سلطان کے دِل کے قریب لگی۔ سلطان زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے اور وہ مرغِ بسمل کی طرح خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ اتنے میں ایک گورا اس کے پاس سے گزرا۔ سلطان کا قیمتی لباس دیکھ کر اُس کا دِل للچایا۔ اس نے قریب جا کر اس کی قیمتی پیٹی اور شمشیر پر ہاتھ ڈالا۔ سلطان نے طیش میں آ کر تلوار کا ایک ہاتھ مارا جس سے اس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ گورے نے غصہ میں

آکر سلطان کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور عین اس وقت جب کہ دونوں وقت مل رہے تھے اور آفتاب شفق کے خون میں غوطے لگا رہا تھا "سلطنت خداداد" کا یہ مہرِ منیر اور حریت و بسالت کا نیرِ اعظم سرنگا پٹم کی دیواروں پر اپنی حسرت بھری الوداعی شعاعیں ڈالتا ہوا ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا ۔

اگر

ٹیپو کی جگہ کوئی اور

کمزور دِل اور ضمیر فروش حکمران

ہوتا تو وُہ انگریزوں کی اطاعت قبول کر کے اپنا

تخت و تاج بچا لیتا۔ مگر ٹیپو کی غیرت نے اس ذِلّت و

رُسوائی کو برداشت کرنے سے

اِنکار کر دیا اور وہ زِندگی بھر ناموافق

حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اُس نے غلامی کی زِندگی پر

موت کو ترجیح دی اور جنگِ آزادی

میں مردانہ وار جامِ شہادت

نوش کیا

شیرِ میسور[1]

از

ہنری ڈاڈویل

ٹیپو کے مقدر ہی میں لکھا تھا کہ وہ زندگی بھر ناموافق حالات کا مقابلہ کرے۔ اس کو اپنے باپ کی وراثت میں ایک عظیم الشان حیثیت ملی تھی۔ اس کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے بھی وہی ذرائع اختیار کئے جو اس کے باپ نے کئے تھے۔ مگر کئی وجوہ کی بنا پر کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ اور اس کی تمام کوششیں کہ وہ اپنے حالات درست کر لے اور ملک کو بہتر بنائے ناکام ثابت ہوئیں۔ ٹیپو صرف حالاتِ زندگی سدھارنے میں ہی بدقسمت نہ تھا بلکہ اپنے مؤرخین کے طرزِ عمل کے

---

[1] یہ مسٹر ہنری ڈاڈویل کے انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔

لحاظ سے بھی چنداں خوش قسمت نہ تھا۔

اس دُنیا میں بہت سے لوگوں نے قدرت کی مخالفت بھی کی لیکن باوجود اس کے ان کی تعریف و توصیف کی گئی۔

مُسلم مؤرخین نے اپنی پُرانی وضع کے مطابق ٹیپُو کی عظمت جتانے کیلئے اس کو اسلام کا شیدائی اور کفّار (ہندو و انگریز) کا دشمن ظاہر کیا۔ انگریزوں نے قدرتی طور پر اسے اپنے لئے ایک خطرناک دشمن سمجھا اور جنوبی ہندوستان میں اس کے زوال کو اپنی فتح کا باعث جانا۔

مُسلمانوں نے اسے ہندو رعایا کے بارے میں غیر ہمدرد اور جابر شہنشاہ ثابت کیا اور غیر مُسلم مؤرخین نے اس کی سیاسی ناکامی کو اس کی بدچلنی اور ناعاقبت اندیشی پر محمول کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو کے اِرد گرد ایسی طاقتیں برسرِ اقتدار تھیں، جن کا وہ صحیح طور پر اندازہ نہ کر سکا۔ اس لئے ضرُوری تھا کہ اس کی تمام کوششیں بے سُود ثابت ہوتیں۔

ٹیپُو ۱۷۸۲ء میں تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہُوا۔ اس وقت تک وہ مہمات اور سیاسیات میں کافی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ ۱۷۸۱ء تک وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کئی لڑائیوں میں حِصّہ لے چکا تھا اور اس کے دُشمن اس کی سیاسی چالوں اور ناگہاں حملوں کے معترف ہو چُکے تھے۔

ٹیپُو کی تعلیم بھی اچھّی خاصی تھی۔ فارسی آسانی کے ساتھ لکھ اور بول سکتا تھا۔ شہسواری میں اپنی نظیر آپ تھا۔ جب اُس کے والد نوّاب حیدر علی نے ارکاٹ میں وفات پائی۔ اس وقت ٹیپُو ملیبار میں انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا۔

اس سانحۂ المناک پر اس کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ آیا وہ مہم کو سر کرے یا دار الخلافہ پہنچ کر تخت و تاج سنبھالے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی سلطنت پر قبضہ جما لیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ٹیپو کو دوہری مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک خانہ جنگیوں کا، دوسرے غیر اقوام سے مقاومت کا۔

چنانچہ وہ مہم ملیبار کو چھوڑ کر سیدھا کرناٹک پہنچا۔ خوش قسمتی سے حیدر علی کے مشیروں اور افسروں نے اپنے تاجدار کی وصیت پر وفاداری کے ساتھ عمل کیا اور ٹیپو کے پہنچتے ہی تخت و تاج اس کے سپرد کر دیا۔

جنگ آزمائی اور سپاہ زرت آرائی ٹیپو کا واحد مقصد تھا۔

انگریزوں کی حالت اس وقت اتنی خراب نہیں تھی کیونکہ انھوں نے مرہٹوں کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد مادھوجی راؤ سیندھیا کے ساتھ عہد نامہ سلبئی کر لیا تھا۔ اب وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کا خیال تھا کہ میسور اور ساحلِ ملیبار پر حملہ کیا جائے۔ ٹیپو کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارا نہ تھا کہ خود جا کر ان کی مدافعت کرے اور دشمنوں کے حملے کا سختی سے جواب دے کیونکہ ملیبار میں موجودہ افواج کسی تنظیم کے ماتحت نہیں تھیں۔ علاوہ بریں فوجی افسر ٹیپو کے پورے وفادار نہ تھے اور بیرونی حملہ آوروں کو مدد دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ لہٰذا بمبئی سے انگریزی افواج نے آتے ہی چند بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا اور بدنور پر حملہ کر کے دار الخلافہ پر قابض ہو گئے۔ ٹیپو طوفان کی سرعت کے ساتھ ان کی مدافعت کے لئے آ پہنچا۔ خوش قسمتی سے انگریزی افواج کی کمان

اچھی نہ تھی۔ کیونکہ فوجوں کا سپہ سالار جنرل میتھو کمپنی کا ایک افسر تھا۔ اور اس کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن اس کے ماتحت افواج اور سرکاری افسر اس کے ساتھ کینہ رکھتے تھے۔ انہی حالات میں ٹیپو نے ان کو بُری طرح شکست دی اور بیدنور پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد منگلور کا محاصرہ کیا اور وہاں سے بھی انگریزوں کو مار بھگایا۔

اس جنگ میں ٹیپو کے ساتھ فرانسیسی دستے اور انجنیئر بھی تھے۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ کارومنڈل ساحل سے جہاں فرانسیسی افواج مقیم تھیں، حکم آیا کہ چونکہ یورپ میں برطانیہ اور فرانس کے مابین صلح ہو گئی ہے اسلئے فرانسیسیوں کو ٹیپو کی امداد سے احتراز کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ٹیپو کی فرانسیسی افواج غیر جانبدار ہو گئیں۔ اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ اس طرح انگریزی افواج جو جنوبی ہند میں فرانسیسیوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں، فارغ ہو گئیں اور انگریزوں کی طاقت پھر مجتمع ہو گئی۔

وارن ہیسٹنگز کی اس پالیسی کو (کہ دشمن کے ساتھ اس وقت تک صلح نہ کرو جب تک وہ پے در پے لڑائیوں کے باعث کمزور نہ ہو جائے) گورنر مدراس نے کوئی اہمیت نہ دی اور غور و فکر کے بعد ٹیپو سے صلح کر لی۔ ٹیپو کو بھی صلح پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اب وہ نہایت بے فکری کے ساتھ انتظامِ سلطنت کی طرف اپنی توجہات مبذول کر سکتا تھا۔ بایں ہمہ ٹیپو یہ بھی چاہتا تھا کہ محاصرۂ منگلور کو اور تقویت دی جائے تاکہ ملیبار کے غدار افسروں کو معلوم ہو جائے کہ انھیں انگریزوں کے ساتھ مل کر کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ٹیپو صلح

کی سفارت کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن ایسے ذرائع اختیار کئے، کہ سفارت کے پہنچنے سے پیشتر محاصرۂ منگلور پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

۱۱ مارچ ۱۷۸۴ء میں عہدنامہ منگلور پر طرفین کے دستخط ہو گئے۔ ٹیپو نے سفارت کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے متعلق غلط طور پر بیان کیا گیا ہے کہ سفیروں کی بڑی بے عزتی کی گئی۔ کمشنروں کی جان خطرہ میں تھی۔ انکے خیموں کے سامنے پھانسیاں لٹکا دی گئیں۔ یہاں تک کہ منگلور سے انگریزوں کے سب جہاز بھاگ گئے اور یہ عہدنامہ انگریزوں سے جبراً منوایا گیا۔ مگر واقعات بالکل مختلف ہیں۔ منگلور کے کمانڈر انچیف کرنل کیمبل کی میسور کے فوجی افسر مجسمۂ علی کے ساتھ در پردہ خط و کتابت تھی۔ اس سازش سے مقصد یہ تھا کہ ٹیپو کی سلطنت کو تباہ کر دیا جائے۔ ٹیپو کو اس سازش کا پتہ چل گیا اور اس انکشاف پر اس نے بہت سے آدمیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا اور جن لوگوں کو اس سازش سے دور کا بھی تعلق تھا، ان کی پھانسیاں منگلور کے ارد گرد ٹیلوں پر کھڑی کر دیں۔ تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ شاہِ وقت کے ساتھ غداری اور دشمنوں سے دوستی رکھنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ جب انگریزی سفیر واپس آئے تو انھوں نے اپنے خیمے اونچی جگہ پر نصب کئے تاکہ اپنے جہازوں کے ساتھ بآسانی اشاروں سے خبریں پہنچاتے رہیں۔

اسی قسم کا ایک اور الزام بھی ٹیپو پر لگایا جاتا ہے کہ "اس نے انگریزی قیدیوں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا۔ بہت سے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا۔ بہتوں کو جان سے مار دیا اور کئی اسیروں کو اپنی قید میں رکھا۔ حالانکہ عہدنامہ کی

رُو سے اُنھیں رہا کر دینا چاہیئے تھا۔

اس واقعے میں صریحاً غلط بیانی کی گئی ہے۔ لازمی امر ہے کہ اگر یقین دِلا دیتے کہ وُہ بھاگنے یا نافرمانی کی کوشش نہ کریں گے تو ان کو قید نہ کیا جاتا لیکن انکی فراری کی کوششوں نے مجبُور کر دیا کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں اور ان کو بُری خوراک دی جائے۔ تاہم ان کی حالت بہتر تھی۔ ان پر صِرف سختی تو ضرُور کی جاتی تھی لیکن ظلم نہیں کیا جاتا تھا۔ ان سختیوں کی وجہ سے بہُت سے نازک مزاج لوگ مر بھی گئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بقول انگریزی مؤرخین ٹیپوُ نے قیدیوں کا قتلِ عام کر دیا۔ حالانکہ اس بات کا کوئی ثبوُت بہم نہیں پہنچایا جا سکا کہ ٹیپوُ نے ایسا کیا۔ انگریز قیدیوں کو جبراً مسلمان بنانے کا واقعہ بھی اسی طرح بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہُت سے ایسے سپاہی بھی تھے جنھوں نے قید کی مصیبت سے تنگ آ کر مذہب کے عوض آزادی خرید لی۔ حالانکہ اُنھیں ختنے کرانے پڑے۔ ٹیپوُ کو ان کے مُسلمان ہونے کی بڑی خوشی ہوُئی کیونکہ وُہ سب سُلطانی فوج میں شامل ہو گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جیل کے داروغوں نے ان قیدیوں کو ایسے سبز باغ دکھائے ہوں کہ وُہ مُسلمان ہونے پر مجبُور ہو گئے ہوں۔

بہر حال اس امر کا کوئی ثبوُت نہیں ملتا کہ ایک شخص کو بھی جبریہ مُسلمان بنایا گیا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ وُہ خود حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا ہو۔ وُہ قیدی جن کو عہد نامہ کے بعد میسُور میں رکھّا گیا۔ لازمی بات ہے کہ مُسلمان ہو گئے۔ کیونکہ اُنھوں نے ٹیپوُ کی سُلطانی تسلیم کر لی اور خود وہیں ٹھہر گئے اور اس طرح ٹیپوُ

کی رعایا بن گئے۔

اگر انگریز عہدنامہ منگلور کو اپنے لئے ذلّت آمیز سمجھیں تو غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو صرف عارضی صلح تھی اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ ٹیپو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے مقابل کی طاقت سمجھتا تھا اور کمپنی کی متزلزل حالت سے متأثر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ انگریزوں کی خارجی پالیسی بالکل ناقص تھی کیونکہ انگریزی افواج ایک دوسرے سے دور اُفتادہ تھیں۔ کچھ بنگال میں، کچھ بمبئی میں اور کچھ مدراس میں۔ انہی وجوہ واسباب کی بنا پر عہدنامہ کیا گیا۔ لیکن ٹیپو ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ انہی حالات کی بنا پر اس کے اور حیدر علی کے ادکاٹ پر سب حملے کامیاب رہے۔ حالاں کہ کرناٹک انگریزوں کی حفاظت میں تھا۔ ٹیپو دل میں تہیّہ کئے ہوئے تھا کہ وہ انگریزوں کی بیخ کنی کر کے چھوڑے گا۔ اس ارادہ کی فرانسیسیوں نے بھی حوصلہ افزائی کی حالانکہ فرانسیسیوں کو فوراً ہی ہندوستان پر قبضہ جمانے کا خیال نہیں تھا۔ البتّہ اُنھیں یقین ضرور تھا کہ یورپ کی آئندہ لڑائی اُنھیں ہندوستان میں اقتدار قائم کرنے کا موقع دے گی۔ ادھر انگریز ٹیپو اور فرانسیسیوں کے باہمی اتحاد و یک جہتی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کا شُبہ حدِ یقین تک پہنچ گیا تھا کیونکہ مغربی ساحل پر بھی ٹیپو کا قبضہ تھا اور کوئی عجب نہیں تھا کہ ٹیپو اس راستے سے فرانسیسیوں کی اِمداد حاصل کر لے۔ اس لئے کہ فرانسیسی کمک اس ساحل سے بلا روک ٹوک ٹیپو کی مدد کے لئے پہنچ سکتی تھی لیکن ٹیپو کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اگر اُسے بروقت یہ حالات معلوم ہو جاتے تو شاید وہ پہلے سے ہی اپنا رویّہ بدل لیتا۔ لیکن بایں ہمہ وہ ایک عظیم الشّان

شخصیت کا مالک تھا اور کسی حالت میں بھی ایک بڑی سے بڑی طاقت کے مطیع ہو کر رہنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

ٹیپو کے یہ سب اوصاف اس کے انتظام مملکت سے ظاہر ہیں۔ مثلاً حیدر علی کے عہدِ حکومت میں میسور کے سکوں پر شاہ عالم شہنشاہِ دہلی کا نام ثبت تھا۔ لیکن یہ محض تکلف تھا۔ انگریز بھی کئی سال تک بنگال میں اس چیز پر عمل پیرا رہے ۱۷۸۶ء کے آغاز میں جب ٹیپو کو مرہٹوں سے جنگ پیش آئی تو اس کے بعد اس نے یہ رواج ترک کر دیا اور خود سلطان کا لقب اختیار کر کے جمعہ کے خطبوں میں اپنے نام کا رواج دیا اور ایسے نئے سکے تیار کروائے جن پر اپنا نام اور لقب کندہ کرایا۔ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے کہ "شاہ عالم کو جو محض سندھیا کا قیدی ہے سوائے چند بیوقوفوں کے کوئی شخص بھی بادشاہ تسلیم نہیں کر سکتا"۔ ٹیپو نے اپنے افسروں کے لئے قواعد وضوابط تیار کرائے۔ سنّ ہجری کے ساتھ ساتھ سنّ میلادی (جو آں حضرت صلعم کی تاریخِ پیدائش سے شروع ہوتا ہے) کا رواج دیا۔ زمینداریوں اور جاگیرداریوں کا خاتمہ کر دیا اور اس قسم کے تجارتی قوانین نافذ کیے جو آج کل بھی مہذّب ممالک کا نصب العین ہیں۔ بیرونی تجارت کا قلع قمع کر دیا۔ ساہوکاروں کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ ریاستی کوٹھیاں مقرر کی گئیں۔

کرنل ولکس محض تعصب کی بنا پر ٹیپو کا ہر ایک بات میں مذاق اڑاتا ہے حالانکہ ٹیپو اکبر کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا اور بعض امور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تقلید کر رہا تھا۔ وہ پہلا ہندوستانی تاجدار ہے جس نے مغربی طریق پر

سلطنت کو منظم کیا لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کو متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں تجربہ کار اور با اصول افسر بھی نہ مل سکے لیکن اس کا دماغ نہایت تیز تھا اور وہ ہر وقت تجربوں سے علم حاصل کرنے کے درپے رہتا تھا۔

ولکس کا یہ اعتراض کہ "ٹیپو نے ہندو رعایا کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی" بالکل بے بنیاد ہے اور (HISTORICAL SKETCHES OF SOUTH-INDIA) میں جو لکھا ہے کہ "ٹیپو نے ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنایا، ان کے ختنے کرائے، مندر گرا کر ان کی جگہ مساجد تعمیر کرائیں" بالکل غلط ہے۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین لکھتا ہے کہ "ٹیپو نے ہندوؤں کی ہمیشہ حمایت کی اور جہاں بھی اس نے ہندوؤں کے ساتھ سختی سے برتاؤ کیا، اس کی وجہ سیاسی تھی نہ کہ مذہبی۔ ٹیپو درحقیقت سخت بادشاہ نہیں تھا بلکہ نہایت شریف اور غیر متعصب تھا۔ اسکے ملک کی تباہی کے درپے کئی طاقتیں تھیں جو اس کی سمجھ میں نہ آسکیں"۔

ٹیپو ٹراونکور کو فتح کرکے ملیبار پر پوری طرح قابض ہونا چاہتا تھا۔ ٹراونکور کے راجہ نے اپنی شمالی سرحدات کو مستحکم کرنے کے لئے ولندیزوں سے چند قلعے خرید لئے۔ جو انھوں نے پرتگیزوں سے چھینے تھے اور ٹراونکور کا راجہ عہدنامہ منگلور کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کا حلیف بن گیا لیکن ٹیپو کو یقین واثق تھا کہ گورنر مدراس ٹراونکور کے راجہ کی مدد نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیپو نے حملہ کر دیا۔ لیکن یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ پہلا گورنر معطل ہو کر چلا گیا تھا اور دوسرا گورنر اس کی جگہ مدراس میں قیام پذیر تھا۔ اُدھر کارنوالس تہیہ کئے ہوئے تھا کہ اپنے دوست ہندو راجہ کی

مدد کرے گا۔ لہٰذا میسور کی تیسری جنگ رُونما ہوئی۔ پچھلی دونوں لڑائیوں میں ٹیپوؒ کے شمالی ہمسائے (نظام اور مرہٹے) یا کمپنی کے خلاف تھے یا غیر جانبدار لیکن اب کے کارنوالس نے دونوں سلطنتوں کے ساتھ معاہدے کرلئے تھے۔ لہٰذا ٹیپوؒ کو انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کے علاوہ پہلی دفعہ اپنی شمالی ریاستوں کی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑا۔

ٹیپوؒ نے نہایت سُرعت کے ساتھ انگریزوں کے حملے کو روکا۔ لیکن لارڈ کارنوالس خود بنگال سے آیا اور جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور حملہ کر کے میسور میں داخل ہو گیا۔ بنگلور فتح کیا اور سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ آخر ۱۷۹۳ء میں عہد نامہ ہوا جس کی رُو سے ٹیپوؒ کو آدھا مُلک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ تین کروڑ روپیہ نقد دینا پڑا اور تاوانِ جنگ کی ادائیگی تک دو بیٹے شہزادہ عبدالخالق اور معزالدین کو بطور یرغمال انگریزوں کے سپرد کیا گیا۔ اب ٹیپوؒ کو یہ فکر تھی کہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کرے۔ وہ بیک وقت تینوں طاقتوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا تھا۔ نظام کی طرف سے تو کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن مرہٹوں کی اچھی خاصی طاقت تھی۔ لہٰذا ٹیپوؒ نے چاہا کہ فرانسیسیوں کی مدد حاصل کی جائے۔ وہ ایک سفارت پیرس بھیج بھی چکا تھا لیکن سوائے اس کے خیر مقدم اور چند انجنیئروں کے ٹیپوؒ کو کچھ نہ مل سکا۔ اُدھر یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس موقعے پر ٹیپوؒ نے ایک اور سفارت فرانس ارسال کی جو انقلابی پارٹی کے ہاں پہنچی۔ انقلابیوں نے ٹیپوؒ کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ مارشئیس کے

گورنر نے اعلان کر دیا کہ جتنے فرانسیسی ہندوستان جا سکیں جائیں اور ٹیپو کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالیں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں لارڈ کارنوالس کی جگہ رچرڈ ولزلی آچکا تھا۔ اس نے آتے ہی مارشیس کا اعلان، بھگلو میں فرانسیسیوں کا آنا اور مصر پر نپولین کے حملہ کا ذکر سنا۔ ان حالات میں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ فرانسیسیوں کی مزید افواج کے پہنچنے سے پہلے ہی میسور کی سلطنت کو تباہ کر دیا جائے۔

ولزلی نے نظام کو مجبور کیا کہ وہ فرانسیسی افسروں کو نکال کر کمپنی کے افسر اور سپاہی اپنی فوج میں بھرتی کرے۔

لارڈ ولزلی نے ٹیپو کو بھی اتحاد و موانست کی دعوت دی لیکن ٹیپو نے وقت کا صحیح استعمال کرنا چاہا اور ولزلی کی دعوتِ صلح کو جس میں نہایت ذلت آمیز شرائط تھیں پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ولزلی تاخیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مئی کے وسط تک فرانسیسیوں کی مدد ٹیپو کو پہنچ جائے گی۔ لہٰذا ۱۷۹۸ء کے آخر میں ولزلی بہ نفسِ نفیس مدراس پہنچ گیا صورتِ حال کا جائزہ لیا اور جنوری ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن ٹیپو انگریزوں کی پیش قدمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے شکار کھیلنے چلا گیا۔ کمپنی کی افواج نے میسور پر دھاوا بول دیا۔ بمبئی کی فوجیں ملیبار کی طرف بڑھیں اور حیدر آبادی اور مدراسی افواج نے سرنگا پٹم پر حملہ کر دیا۔ ان کو خفیہ ہدایات تھیں کہ سرنگا پٹم پر پوری طرح قبضہ کر لیا جائے۔ ٹیپو اگر لڑے تو مقابلہ کرو اور اگر صلح کی خواہش کرے تو اس کی سفارت سے ملو۔ اُس کے

ارادوں پر بحث کرو، اپنی شرائط پیش کرو لیکن آگے بڑھتے جاؤ۔ اپریل میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ۲۱ رمئی کو شہر کی فصیلوں پر بمباری کی گئی اور ٹیپو گولی لگنے سے شہید ہو گیا۔

اس فیصلہ کن جنگ میں ٹیپو کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ اگر وہ چاہتا تو رنجیت سنگھ کی طرح اپنے آپ کو بچا سکتا تھا لیکن اُسے زندگی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک غیور انسان تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ولزلی کو اس کے خفیہ ارادوں کا پتہ چل گیا ہے۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی بحری طاقت بھی ٹیپو کے لئے نہایت مُضر ثابت ہوئی اور ٹیپو ایسی طاقتوں میں آکر پِس گیا جن کو وہ کما حقہٗ نہ سمجھ سکا۔ لیکن درحقیقت اس کی شیر دلی، اس کے دلیرانہ اوصاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پیہم کوشش اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اس کی جگہ ہمسایہ طاقتوں کی طرح کوئی کمزور دِل اور ضمیر فروش بادشاہ ہوتا تو مطیع ہو کر اپنا تخت و تاج بچا لیتا۔

شیرِ ہندوستان ٹیپو سلطان

(پروفیسر حافظ محمود شیرانی)

عجائباتِ زمانہ کے اے تماشائی رہا ہے سیرِ جہاں کا جو تو تمنائی
محیطِ ارض پہ کی تو نے گام فرسائی قطب سے کی ہے قطب تک کی دشت پیمائی
نظر میں ہے تری خورشید کا طلوع و غروب
زمیں کے دیکھ کے آیا ہے تو شمال و جنوب

افق میں جبکہ عناصر میں ہو صف آرائی جہاز لائے تباہی میں فوج دریائی
فضا میں جب کہ چلی ہو سموم صحرائی غبارِ دشت سے آنکھوں میں تیرگی چھائی
ہر ایک حال میں چلنے سے کام ہے تجھ کو
نہ لطفِ صبح نہ کچھ خوفِ شام ہے تجھ کو

دیارِ ہند میں جب سیر کے لئے آنا تو اپنے پہلو میں تو اک دلِ حزیں لانا
عجائبات میں یاں کے نہ دل کو الجھانا دکن میں جا کے سرنگا پٹم چلے جانا
کہ جس کی خاک میں سوتا ہے شیرِ ہندوستاں
زمانہ بھول گیا ہائے جس کے سب احساں

ادب ہے شرط تجھے اس مقام عبرت پر بہانا اشک تو اُس تاجور کی تربت پر
فلک سے لڑنا تو اُس نامور کی حسرت پر ہزار آفرین اُس شیر دل کی غیرت پر

کہ جس کے نام سے ڈرتے تھے بچگانِ فرنگ
جُھکا ہے سامنے جس کے بہت نشانِ فرنگ

زمینِ ہند سے اُٹھا نہ کوئی فرزانہ رہا یہ مُلک ہمیشہ مطیعِ بیگانہ
بہ قدرِ ظرف جو مِلتا کسی کو پیمانہ دکھاتا کر کے وہ کچھ ہاؤ ہوئے مستانہ

جہاں نے ختم کیے دورہائے سالِ دراز
ہُوا نہ پیدا ٹیپو سا کوئی ہمسر آواز

وُہ بادہ جس سے کہ سُلطان لودی تھا مسرُور وُہ آگ جس سے مراجل کے شیر شاہِ سوُر
وُہ نوش جس سے کہ مدہوش ہو گیا تھا پوُر اسی شراب نے ٹیپوُ کو بھی کِیا مخمُور

زمانہ گرچہ مخالف بھی پایا ٹیپوُ نے
کرے گا کون جو کچھ کر دکھایا ٹیپوُ نے

سپہرِ ہند کا وُہ اِک چمکتا اختر تھا دکن کی خاک کا اِک آبدار گوہر تھا
نصیبِ ہند تھا، اقبال تھا، مقدّر تھا نہ ہو کیوں ایسا کہ آخر تو ابنِ حیدر تھا

خیال کچھ نہ کیا اُس نے اپنی رحمت کا
قدم قدم پر رکھّا دھیان اس وصیت کا

فلک بکامِ تو باشد کہ اہتمام کند سپہر بادۂ عیش ترا بجام کند
زمانہ خنجر کین تو در نیام کند اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

ترا کہ زور بازوئے تیغ زن باقی است

بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقی ست

نہ ڈھونڈو طلعتِ سحرگاہ شامِ ماتم میں
کبھی نہ دیکھو گے ذی الحجّہ تم محرّم میں
دکھائے خاک بہار اپنی باغِ عالم میں
وہ پھول جو کہ کھلا ہو خزاں کے موسم میں
کیئے خدا نے مقرر ہر ایک کام کے وقت
سحر کا کام بھلا ہائے اُس کو شام کے وقت

دکھلائے اُس نے شجاعت کے خوب ہی جوہر
اِدھر وہ یکہ و تنہا خدائی ساری اُدھر
وہ کیا کرے کہ نہ ہو جس کا آسمان یاور
شکست و فتح تو ہے منحصر مقدر پر
نہ ہارا حوصلہ اُس تیغ راں نے خوب کیا
مقابلہ تو مرے پہلواں نے خوب کیا

نظام دیکھ کے اندازِ جنگ ہے مسرور
پھرا ہے پیشوا لے کر غنیمت موفور
نہ کھینچیں کس لئے انگریز اپنے آپ کو دور
کہ جس سے رکھتے تھے دِل میں وہ سینکڑوں ناسور
پڑا ہے خاک پہ اس ناتواں کا لاشہ ہائے
فلک! یہ تو نے دکھایا ہے کیا تماشہ ہائے

وہ بادہ جس کا کہ خانِ شہید تھا شیدا
وہ نوش جس کو کہ تغلق نے تھا پسند کیا
وہ زہر جس کا کہ ہیموں نے پی لیا پیالہ
ازل کے دن سے وہ حصۂ نصیب ٹیپو تھا
مرا وہ موت جسے کہیئے عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں اس کو سپاہیانہ موت

بجا ہے اُس کو جو بیدادگر کہیں انگریز
روا ہے اُس کو اگر بے خبر کہیں انگریز
درست ہے جو اُسے بے ہُنر کہیں انگریز
رقیب کو ستم آرا اگر کہیں انگریز

کہ اُس کے آگے چھلکتا رہا ایاغ فرنگ

جلا نہ سامنے اُس کے کبھی چراغ فرنگ

ہزاروں اُٹھ گئے دُنیا سے بے پھلے پھُولے — وُہ ہونہار جو دُنیا میں آئے اور نہ رہے

وُہ تازہ غنچے جو مُرجھا گئے بغیر کھِلے — اسیطرح ہو گیا ٹیپُو وقت سے پہلے

کہ اس کی موت ہی آئی شباب سے پہلے

پلایا زہر ہی اُس کو شراب سے پہلے

رہا زمانے میں کچھ روز میہماں کی طرح — بہار اُس کی جو آئی بھی تو خزاں کی طرح

چھپا جہان سے وُہ گنج شائگاں کی طرح — دِلوں سے محو ہُوا یادِ رفتگاں کی طرح

کسی بشر نے نہ کی اُس پہ اَشک افشانی

فرشتے گور پہ کرتے ہیں فاتحہ خوانی

بہار گائیں گی جب بُلبُلیں گُلستاں میں — خزاں کا دَور ہو جب موسم زمستاں میں

حریف دو ہوں مقابل جب ایک میداں میں — اُڑائیں ساغرِ مے جب کہ بزم یاراں میں

جہاں میں رسم ہے جب تک کہ شادی و ماتم

ہمیشہ روئے گا اُس کے لئے سرنگاپٹم

ٹیپو کی موت

محض ایک بلند ہمّت مجاہد اور
ایک شیردِل فرمانروا ہی کی موت
نہ تھی بلکہ اُس کے ساتھ حفاظتِ وطن کا ہر ہنگامۂ عمل
مرگیا۔ وہ فولادی بند ٹوٹ گیا جو برسوں اجنبی اقتدار کے
سیلاب کو بے باکانہ مُلک بھر میں چھا جانے سے روکے رہا۔
وہ آتشکدہ افسُردہ ہوگیا
جس سے آتشِ آزادی کے شعلے پیہم اُٹھتے رہے
اور اس کم نصیب سرزمین کی آرزوؤں کو
زندگی کی حرارت بخشتے رہے ۔یہ ایک
فرد کی موت نہ تھی بلکہ ہندوستان کے
جہادِ استقلال کی موت تھی!

ایسٹ انڈیا کمپنی اور سُلطان شہیدؒ

تصویر کا دُوسرا رُخ

(جناب مولانا غلام رسُول صاحب مہرؔ مدیر روزنامہ "انقلاب" لاہور)

ٹیپُو سلطان کی شہادت ہندوستان کی تاریخ میں حُریت و استقلال کا ایک نہایت درد انگیز اور خُونچکاں باب ہے۔ یہ ایک بلند ہمّت مجاہد اور ایک شیر دِل فرمانروا ہی کی موت نہ تھی بلکہ اسکے ساتھ حفاظتِ وطن کا ہر نگا عمل مر گیا۔ وہ فولادی بند ٹوٹ گیا جو

برسوں اجنبی اقتدار کے سیلاب کو بے باکانہ مُلک بھر پر چھا جانے سے روکے رہا۔ وُہ آتشکدہ افسردہ ہوگیا جس سے عشقِ آزادی کے شعلے پیہم اُٹھتے رہے اور اس کم نصیب سرزمین کی آرزوؤں کو زندگی کی حرارت بخشتے رہے۔ یہ ایک فرد کی موت نہ تھی بلکہ ہندوستان کے جہادِ استقلال کی موت تھی۔ آج اس واقعے پر تقریباً ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں لیکن اُمید کا جو روشن چراغ ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم میں گُل ہُوا تھا۔ کیا اس کی ضیا گستری پھر ہماری بزم کی آرائش اور ہمارے ایوانِ حیات کی زینت بن سکی؟

تلوار گُم ہو گئی:

سُلطان کی شہادت پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں لیکن ان میں سے دو مجھے کبھی نہیں بھُولتیں۔ اوّل "شمشیر گُم شد"، دوم "ذَہَبَ عِزُّ الرُّومِ وَالہِندِ کُلُّھَا"۔ سُلطان کی موت کی تعبیر کا اس سے بہتر اسلوب کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی شمشیرِ حفظ و دفاع گُم ہو گئی اور وُہ نہتا رہ گیا۔ حضرت علّامہ اقبالؒ نے عالمگیرِ اعظم کو اسلامیانِ ہند کے ترکش کا آخری تیر قرار دیا تھا۔ ٹیپو سُلطان یقیناً اسلام اور ہندوستان کی آخری ذوالفقار تھی۔ ان کی شہادت سے یہ ذوالفقار اس طرح گُم ہُوئی کہ آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔

عزّت کا زوال:

ہندوستان اور ترکی یا ہندوستان اور اسلامستان کی عزّت کے زوال و ضیاع کا ماتم محض یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک طرف میسُور کی سلطنت مُسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دُوسری طرف مصر پر فرانسیسی قابض ہو گئے لیکن بعد کے واقعات نے

ثابت کر دیا کہ زوالِ عزّت کے حدود بہت وسیع تھے۔ ٹیپو سلطان کی موت سے ہندوستان بھر پر اجنبی اقتدار کے تمام دروازے کھل گئے اور یہ ملک پچاس برس کے اندر اندر کاملاً دولتِ انگلشیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کے تمام اسلامی ملکوں میں فرنگستانی استعمار کے جال بچھ گئے۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کون اس حقیقت کا اعتراف نہ کرے گا کہ ٹیپو سلطان کی شہادت ہندوستان اور اسلامستان کی عزّت و حرمت زائل ہو جانے کا سب سے بڑا نشان تھی!

سلطان کے مقام سے بے خبری!

مدت دراز تک سلطان کی شخصیت و عظمت کے متعلق ہندوستانیوں پر فی الجملہ بے خبری یا اضطراری سکوت کا دور طاری رہا۔ اس کی علت محتاج تشریح نہیں۔ انگریز ہندوستان پر چھا گئے تھے۔ اس حالت میں کون سے قلم اور کون سی زبان کو حوصلہ ہو سکتا تھا کہ انگریزی تسلط کے سب سے بڑے اور جانباز مخالف کے مقام و مرتبت کا صحیح اندازہ کرے یا اس کے اوصاف و محاسن کو ابھارنے پر متوجہ ہو۔ انگریزوں نے جو کچھ لکھا یا ان کے زیرِ اثر قلموں سے جو کچھ ٹپکا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سلطان انگریزوں کا شدید دشمن تھا۔ اسی وجہ سے دولتِ انگلشیہ اس کے خلاف لڑنے پر مجبور ہوئی۔ ہر ممکن کوشش سے سلطان کی اس دشمنی کو نمایاں کیا گیا۔

تصویر کا دُوسرا رُخ:

یہ مخالفوں کا کام تھا لیکن جب حالات میں تغیر پیدا ہوا۔ قلموں اور زبانوں کو مواخذہ کے ہراس سے نجات ملی۔ نقطۂ نگاہ بدلا اور دوستوں نے سلطان کی ذات پر توجہ مبذول کی تو انھیں بھی اس مرحُوم کی سب سے بڑی اور ممتاز خصُوصیت یہی نظر آئی کہ وُہ انگریزی اقتدار کا شدید ترین مخالف تھا۔ اس تصویر کے دُوسرے رُخ اور اس نظر کے دُوسرے پہلُو تک کسی کی نگاہ نہ پہنچی۔ یہ کسی نے نہ دیکھا کہ جس اقتدار کی مخالفت میں سلطان نے اپنی زندگی کی متاع بے دریغ لُٹا دی۔ اس اقتدار کے کارپرداز سُلطان ٹیپُو کے متعلّق کیا رائے رکھتے تھے؟

ذیل کی سطور میں اسی سوال کا جواب تلاش کیا گیا ہے۔ پُوری داستان بہت لمبی ہے اور اسے بیان کرنے کے لئے ایک مقالے کی مختصر سی صحبت کفایت نہیں کرسکتی۔ مَیں یہاں اس کے چند متفرق ٹکڑے سُناتا ہُوں ؏

تو خوُد حدیثِ مفصّل بخواں ازیں مجمل

ایسٹ اِنڈیا کمپنی کا عرُوج

عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان کے وطنی نظام میں فساد و اختلال کا جو عمل جاری ہو گیا تھا اُس نے تیس چالیس برس کی مُدّت میں اس مُلک کی رُوحِ حیات تحلیل کر ڈالی۔ ہندوستان ایک زندہ اور قائم وجود نہ رہا بلکہ اسکے

تمام اعضاء یکے بعد دیگرے کٹ کٹ کر الگ ہوتے گئے۔ مختلف حاکموں اور صوبیداروں نے جابجا خود مختار یا نیم خود مختار حکومتیں قائم کرلیں جن میں مسلسل خانہ جنگی جاری تھی۔ فرنگستان کی تجارتی کمپنیوں نے ان حالات سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ ان کے پاس اتنی مادی طاقت و قوت تو تھی نہیں کہ مستقلاً سلطنت کی دعوے دار بن جاتیں یا توقع رکھتیں کہ مُلکی باشندے بطیبِ خاطر ان کا اقتدار گوارا کرلیں گے۔ لہٰذا انھوں نے چھوٹے چھوٹے مُلکی فرمانرواؤں کی خدمت و حمایت کا نقاب اوڑھ کر میدانِ عمل میں قدم رکھا اور تدریجاً اپنے دائرۂ اقتدار کو بڑھا کر مستقل حیثیت حاصل کر گئیں۔ انھیں باہمی کشمکش سے بھی سابقہ پڑا۔ بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی سب پر غالب آئی اور وہی آگے چل کر سارے ہندوستان کی مالک بن گئی۔

دکن کی تین وطنی طاقتیں:

اٹھارویں صدی کے آخری تیس بتیس برس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دکن میں تین مُلکی حکمرانوں سے سابقہ پڑا۔ اوّل نظام۔ دوم مرہٹے۔ سوم فرماں روایانِ میسور۔ نظام کی سلطنت کے حدود کافی وسیع تھے اور اس کے وسائل کی فراوانی مسلّم تھی۔ لیکن اس کے پاس اچھے کارپرداز نہ تھے جو ان وسائل سے پورا فائدہ اٹھا سکتے۔ مرہٹوں کی طاقت باہمی کشمکش کے باعث بڑی حد تک معطّل ہوچکی تھی۔ اور احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں ان پر ایسی مُہلک ضرب لگادی تھی کہ ہندوستان گیری کا خواب ہمیشہ کے لئے پریشان ہوگیا۔ میسور کی سلطنت ابتدا میں ایک معمولی سی ریاست تھی لیکن حیدر علی نے ۱۷۶۱ء

چند ہی سال میں ایک زبردست اور پُر زور جنگی طاقت بنا دیا جس کی ممکناتِ عمل و کار سے سب ہراساں تھے۔

تفرقہ اور خانہ جنگی کے نتائج:

اس سلطنت کو مختلف اوقات میں ایسٹ انڈیا کمپنی، مرہٹوں اور نظام تینوں سے جنگ کرنی پڑی۔ اُس نے شکستیں بھی کھائیں، ہزیمتیں بھی اُٹھائیں لیکن تمام مشکلات و موانع کے باوجود اس کی رُوحِ حیات اُبھرتی رہی۔ اُسکی ہمّت فتح و تسخیر قریب تر ہوتی گئی۔ اگر وقت کے مُلکی فرماں روا حالات کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ آپس کی رقابتیں مٹا ڈالتے اور مُلکی مقاصد کے لئے متحد ہو جاتے تو میسُور کی قیادت و سالاری میں اجنبی اقتدار یقیناً ختم ہو جاتا۔ ہندوستان کی تاریخ کا رنگ بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن افسوس کہ حیدر علی اور ٹیپُو سلطان کی سرگرم کوششوں کے باوجُود مُلکی عناصر کے درمیان بلند مقاصد کے لئے وحدت و یک آہنگی پیدا نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ نِکلا کہ پہلے سلطنتِ میسُور مِٹی۔ اس کے بعد مرہٹوں اور نظام کو جن حالات سے سابقہ پڑا اُن کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

میسُور کے متعلّق انگریزوں کی رائے:

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں نے مرہٹوں اور نظام سے پے در پے معاہدے کئے۔ ان کی غرض یہ تھی کہ سلطنتِ میسُور کو ہر طرف سے خطرہ لگا رہے اور وہ امن کی فرصت سے فائدہ اُٹھا کر طاقتور نہ بن سکے۔ مرہٹوں یا نظام سے انھیں محبّت نہ تھی لیکن وُہ جانتے تھے کہ ان دونوں کے مقابلے

میں سلطنتِ میسور زیادہ طاقتور، زیادہ اصلح اور زیادہ قوی ہے۔ اور اس سلطنت کو مٹانے یا دبائے رکھنے کی بہترین شکل یہی ہے کہ نظام اور مرہٹوں کی امداد حاصل کی جائے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ ٹیپو سلطان کو بالکل فنا نہ کیا جائے ورنہ مرہٹے بہت طاقتور ہو جائیں گے اور ان کے خلاف کسی مُلکی طاقت سے کام لینے کا موقع باقی نہ رہے گا لیکن آخرکار سب کی رائے یہی ٹھہری کہ ٹیپو سلطان کو آزاد نہ چھوڑا جائے۔ ساری تدبیریں اسی کو بے دست و پا بنانے کے لئے وقف ہو گئیں۔ انہی تدبیروں کو توڑنے کی کوشش میں ٹیپو سُلطان شہید ہو گئے اور ان کی سلطنت کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

اس مختصر سی تمہید کے ساتھ مَیں بعض انگریزی بیانات پیش کرتا ہوں۔ جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ انگریزوں کی رائے ٹیپو سلطان کے متعلق کیا تھی۔ ضمناً سلطان کی اصلحیت، حُسنِ انتظام اور جوشِ عمل کے مختلف مناظر سامنے آجائیں گے، جن کی وجہ سے کمپنی کے کارکن سُلطان کی مخالفت میں حد درجہ سرگرمی سے کمربستہ ہو گئے۔

سر ٹامس منرو کے خطوط:

سر ٹامس منرو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک جرنیل تھا جو مختلف حیثیتوں میں دُوسری اور تیسری جنگِ میسور میں شامل رہا۔ ۱۸۲۰ء میں مدراس کا گورنر بن گیا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کی سوانحعمری دو جلدوں میں چھپی ہے جس میں اس کے بیشتر خطوط درج ہیں۔ مَیں ذیل میں ان خطوط

کے بعض اقتباسات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جن میں سلطنتِ میسور کا ذکر آیا ہے۔

تیسری جنگِ میسور کے آغاز پر ٹامس منرو اپنے باپ کو لکھتا ہے کہ جو لوگ انگریزی معاملات کے مختار ہیں وہ شاید سمجھ رہے ہیں کہ ٹیپو سلطان کو مرہٹوں کے مقابلے کے لئے قائم رکھنا ضروری ہے لیکن اسکا مطلب تو یہ ہوگا کہ:

"ایک کمزور دشمن (مرہٹوں) سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے ہم ایک طاقتور اور اولوالعزم دشمن (ٹیپو سلطان) کی حمایت کریں۔ ایک (سلطان) کی ہمسائیگی سے ہمیں ہر قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے (مرہٹوں) سے قطعًا کوئی اندیشہ نہیں"

مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کا موازنہ:

منرو آگے بڑھ کر سلطان اور مرہٹوں کی حکومتوں کا موازنہ کرتا ہوا لکھتا ہے:

"ایک (میسور) دنیا کی خالص مطلق العنان حکومت ہے جس کا ہر شعبہ خواہ وہ عسکری ہو یا دیوانی، بالغ نظر اور اولوالعزم حیدر کے جاری کردہ نظم وقاعدہ کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں نسب و خاندان کی بلندی کے دعاوی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ تمام خود مختار سردار اور زمیندار یا تو مطیع ہو چکے ہیں، یا فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ تمام طبقات کے ساتھ بلا امتیاز بالا و پست خالص عدل کا برتاؤ ہوتا ہے۔ کثیر التعداد کاردان فوج تیار رہے۔

ذمہ داری اور اعتماد کے قریباً تمام عہدے ایسے لوگوں کو دیئے گئے ہیں جو گمنامی سے اُٹھ کر بلند رُتبہ پر پہنچے - ان حالات نے حکومت میں ایسی قوت و طاقت پیدا کر دی ہے جس کی مثال سے ہندوستان اب تک خالی ہے -

باقی رہی دوسری حکومت (یعنی مرہٹے) تو یہ خود مختار سرداروں کا مجموعہ ہے - ان کے علاقے بہت وسیع ہیں - فوجیں بے شمار ہیں - کبھی وہ متحد ہو جاتے ہیں، کبھی ایک دوسرے پر حسد کرنے لگتے ہیں - ہر شخص اپنے فائدے کے لئے کوشاں ہے اور سب کو ہر لحظہ مقصدِ عامہ سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ انھیں ذاتی فائدے کی اُمید دلا دی جائے خواہ اس کا حصول کتنا ہی بعید ہو -

ٹیپو سُلطان کی عدیم المثال صلاحیتیں:

یہ بیانات کسی تشریح و تشبیہ کے محتاج نہیں ہیں - مسز دیپر لکھتا ہے:

"میسور کی حکومت میں اس کے بانیوں (حیدر علی اور ٹیپو سُلطان) نے طاقت و استحکام کی ایک ایسی روح پھونک دی ہے کہ یہ ایک کمزور یا نابالغ حکمران کے ماتحت بھی مضمحل نہ ہو گی، لیکن مرہٹوں کی مرکزی حکومت کی طاقت اس کے مختلف ارکان کے وقتی رُجحانات کے مطابق ہر لحظہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے - وہ بعض اوقات اتحاد سے اسے قوی بنا دیتے ہیں بعض اوقات اپنے اختلافات سے اسے کمزور کر دیتے ہیں -

مرہٹوں کے پاس کوئی مستقل فوج بھی نہیں - نہ ان میں لشکروں کی

ترتیب کا یورپی طریق رائج ہے۔ نہ وہ کسی مذہبی جذبہ سے متاثر ہیں کہ اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کی تباہی کے لئے کوشاں ہوں لیکن میسور کے پاس ایک لاکھ دس ہزار قواعد دان فوج موجود ہے جس کا بڑا حصہ غلاموں پر مشتمل ہے۔ انھیں "چیلے" کہا جاتا ہے۔ ان کی تربیت ترک ینیچریوں کے اصول پر ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ٹیپو یورپی فنونِ حرب کے تمام اصولوں کو انتہائی شوق و سرگرمی سے اختیار کر لیتا ہے۔ اس نے اپنے افسروں کے استعمال کے لئے ایک کتاب[1] شائع کی ہے جس میں فوجی نقل و حرکت کے وہ تمام قواعد درج ہیں جو یورپ میں رائج ہیں۔ نیز سلطان کے اختراع کردہ قاعدے اس میں شامل ہیں۔ کوچ، مقام اور جنگ کے متعلق تمام ہدایات جمع کر دی گئی ہیں۔ ٹیپو سلطان اپنی تمام غیر معمولی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ایسے مذہب کا پُرجوش پرستار ہے جو (معاذ اللہ) دوسرے فرقوں کی بربادی کو دائمی راحت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔"

(وارٹف آف منرو۔ جلد اوّل صفحہ ۹۶، ۹۷)

مخالفت کی علّت کیا تھی!

اسلام کے متعلق جس بے خبری کا ثبوت ٹامس منرو نے آخری فقرے میں دیا ہے۔ اسے نظر انداز کر دیجئے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے پُرجوش مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے اس قسم کی ٹھوکریں اکثر غیر مسلموں نے کھائیں لیکن اس بیان سے سلطان

---

[1] یہ فتح المجاہدین کی طرف اشارہ ہے جو غالباً ۱۷۸۶ء میں مدوّن ہوئی تھی۔ افسوس کہ یہ چھپ نہ سکی اس کے قلمی نسخے جا بجا موجود ہیں۔

کی اعلیٰ فوجی اور انتظامی قابلیت، مؤثر دفاعی انتظامات اور پُرجوش ذہنیت کے شواہد بالکل آشکارا ہیں اور یہ بیان کسی دوست کا نہیں بلکہ مخالف کا ہے اور اس وقت ہے جبکہ انگریز سلطان سے برسرِ پیکار تھے۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انگریز سلطان کی ترقی، طاقتوری اور حُسنِ انتظام پر خوش تھے اور ان اوصاف کی وجہ سے سلطان کے دوست بنے رہنا چاہتے تھے؟

جب تیسری جنگِ میسور میں سلطان کو مجبور ہو کر صلح کی درخواست کرنی پڑی اور اس کے سفیر معاہدۂ صلح کی گفت و شنید کے لئے انگریزوں کے پاس پہنچ گئے تو منرو ان کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:

"یہ سفیر میرے لئے مستقل پریشانی کا باعث ہیں۔ مجھے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے کہ برطانوی کمزوری اور بے خبری کہیں نرمی اور انصاف کا جامہ پہن کر ٹیپو کی طاقت کو از سرِ نو قائم نہ کر دے"۔

(لائف آف منرو۔ جلد اوّل صفحہ ۱۲۶)

کاش تینوں طاقتیں متحد ہو جائیں!

ایک مقام پر وہ سلطان کے قوائے حربی کی خستگی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:

"کیا ہم اپنے مقبوضہ علاقوں کی توسیع اور مالیہ و قوت کی بیشی کا ایک سازگار موقع صرف اس لئے کھو دیں گے کہ بعض اشخاص جنھوں نے یورپ میں قوتوں کے توازن کا جملہ سُن رکھا ہے، سمجھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں اس کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا؟ کیا موجودہ جنگ (تیسری جنگِ میسور) اس بات کا زبردست ثبوت نہیں کہ ہمارے لئے توازن قائم رکھنا مشکل ہے؟

مختلف طاقتوں کے جس اتحاد نے اب ٹیپو کو ناکام بنا دیا ہے، کیا یہی اتحاد کسی موقع پر ہمارے لئے مہلک ثابت نہیں ہو سکتا؟..... ہو سکتا ہے کہ نظام کی مسند پر کوئی قابل حکمران آ بیٹھے۔ ہو سکتا ہے کہ مرہٹے کسی وقت متحد ہو جائیں۔ یہ دونوں طاقتیں ٹیپو جیسے حکمران سے مل جائیں تو انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کر دینا غیر ممکن نہ رہے گا۔ یہ سب لوگ انگریزی علاقے آپس میں بانٹ لیں گے۔ ایسی صورتِ حالات سے بچنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ٹیپو کو تباہ کر دیا جائے۔"

(لائف آف منرو۔ ص ۱۲۹)

میسور میں اسلحہ سازی کی کارگاہیں:

منرو ایک اور مقام پر مرہٹہ طاقت کی بے حقیقتی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "ان کے متعلق خوف کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ انھوں نے جو ترقی کی وہ ان کی قابلیت کے بجائے مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کارپردازوں کی ناقابلیت کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا، اورنگ زیب کی وفات کے بعد اور حیدر علی یا انگریزوں کے ظہور سے پہلے کیا۔ جونہی حیدر علی اور انگریز برسرِ کار آ گئے۔ مرہٹوں کی ترقی رُک گئی اور پانی پت کے میدان میں ان کی اجتماعی طاقت پر ایک ایسی ضرب لگی جس سے وہ شاید ہی جانبر ہو سکے۔ پھر وہ اپنے فرسودہ اطوار پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ جب سے انھوں نے فرنگیوں کے ساتھ شناسائی پیدا کی ہے، جنگ کا کوئی نیا فن نہیں سیکھا۔ یہی حالت نظام کی ہے لیکن:

"میسور کا معاملہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ حیدر کی منظم و محکم حکومت اس کے فرزند کی سرکردگی میں زیادہ منظم اور طاقتور بن گئی ہے یورپی ڈسپلن کو زیادہ سختی سے رائج کیا گیا ہے۔ تمام آتش بار اسلحہ جو پہلے اجنبیوں سے منگائے جاتے تھے اب غیر ملکی کاریگروں کی نگرانی میں اس کی (ٹیپو سلطان) کی رعایا بنا رہی ہے۔"

سلطان کی ہر دلعزیزی:

محض یہی سچ نہ تھا کہ ٹیپو سلطان ہر کارآمد طریقہ بلا توقف اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی سپاہ میں اعلےٰ ڈسپلن رائج ہے۔ اُس کے پاس بندوقوں اور توپوں کے کارخانے ہیں۔ بلکہ اس بات پر رنج تھا کہ سلطان کے تمام افسر بڑے خود دار تھے۔ خود ہندوستانیوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ افسروں اور امیروں کی غداری سلطان کی شہادت کا بڑا سبب تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض افسروں کا دامن اس داغ سے آلودہ نظر آتا ہے اور اس باب میں بحث طولِ کلام کی محتاج ہے لیکن آپ اس پہلو کے متعلق سر ٹامس منرو کی شہادت سُن لیجئے۔ وہ لکھتا ہے:

"سلطان نے مختلف قواعد و ضوابط اور مختلف ادارات کے ذریعے سے اپنی رعایا کے ہر طبقے میں اطاعت، پابندی، نظم اور خبرداری کی ایسی روح پیدا کر دی ہے کہ اسے کبھی ان حوادث سے سابقہ نہیں پڑا جو ایشیا کے اندر جنگوں میں ناکام رہنے کے لازمی نتائج سمجھے جاتے ہیں یعنی سرداروں کی بغاوت یا عام آدمیوں کی غداری۔ سلطان نے جو نقصان اُٹھایا

دشمنوں کی اعلےٰ طاقت کی وجہ سے اُٹھایا۔ اس کے افسروں کی غدّاری کو اس نقصان میں قطعاً دخل نہیں۔ جب وُہ مجبُور ہو کر دارالحکُومت (سرنگاپٹم) میں بند ہوگیا (یہ تیسری جنگِ میسُور کا ذکر ہے) اُسوقت بھی دُور افتادہ صوبوں پر اس کا تسلّط بدستور قائم تھا۔ یہاں تک کہ مرہٹے کوشش کے باوجود دھارواڑ سے سرنگاپٹم کی طرف روانگی کی اطلاع لارڈ کارنوالس کو نہ پہنچا سکے۔ (یعنی دھارواڑ سے سرنگاپٹم اطلاع پہنچانے کے لئے سلطنتِ میسُور کا کوئی آدمی تیار نہ ہوُا۔"

انگریزی تسلّط میں رُکاوٹ:

ایک مقام پر منرو انگریزی مقبوضات کی توسیع پر بحث کرتا ہوُا لکھتا ہے کہ مختلف اطراف میں فلاں فلاں مقامات پر قبضہ جمالینا چاہیئے۔ پھر خُود ہی کہتا ہے کہ یہ سب کچھ فی الفور پوُرا نہیں ہو سکتا۔ انگریزوں کو عجلت سے کام نہ لینا چاہیئے بلکہ دیسی حکومتوں کے انقلابات و اختلافات پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ہمیں خوُد معلوم ہو جائے گا کہ اس توسیع کے لئے بہترین وقت کون سا ہے لیکن:

"جب تک ٹیپو زندہ ہے یہ وقت نہیں آسکتا۔ جب تک اس کی طاقت نہ توڑی جائے گی، توسیع تو رہی ایک طرف۔ ہمیں ہر لحظ اپنے موجودہ مقبوضات کے چھِن جانے کا خطرہ لگا رہے گا۔ پھر جب ہمیں موقع حاصل ہوگیا ہے۔ (یعنی تیسری جنگ میسور میں) تو کیوں ایسے خطرناک دُشمن کا خاتمہ نہ کر ڈالیں۔"

منرو کو یہ کہنا چاہیئے کہ اس وقت کے انگریز کارپردازوں کو محض سلطان کی ذات سے خطرہ نہ تھا بلکہ اُنھیں یہ تشویش بھی لگی ہُوئی تھی کہ کہیں ٹیپوؔ کے اعلےٰ نظامِ سلطنت، بلند مقاصد، حُسنِ نظم و ضبط اور ہنگامہ خیز جنگی تیاریوں کی حرارت کسی دُوسری ہمسایہ سلطنت کے دِل میں نہ پیدا ہو جائے اور یہ "وبا" متعدی نہ بن جائے:

"اگر اس کا ڈھانچہ (ٹیپو کے نظامِ سلطنت کا ڈھانچہ) توڑا نہ گیا تو ممکن ہے یہ آہستہ آہستہ نظام حیدر آباد کے کسی جانشین یا دکن کے آئندہ مسلمان حکمران تک جا پہنچے - اگر ایک دفعہ اسے توڑ ڈالا گیا تو پھر اس کے بحال ہونے کا کوئی خطرہ نہیں - اسے دوبارہ قائم کرنے کے لئے حیدر علی جیسے اولوالعزم انسان کی ضرورت ہوگی جو صدیوں میں بمشکل پیدا ہوتا ہے "

آزاد نہ چھوڑا جائے:

غرض انگریز سیاست دانوں کے لئے ٹیپوؔ سلطان کے تمام محاسن حکمرانی و فرمانروائی باعثِ ملال بنے ہُوئے تھے - ان میں ایک جغرافیائی مصیبت بھی تھی، یعنی یہ کہ ٹیپوؔ سلطان کی سلطنت ساحلِ بحر پر واقع تھی - وہ بے تکلف باہر کی حکومتوں اور سلطنتوں کے ساتھ نامہ و پیام جاری رکھ سکتا تھا - ہر قسم کا سامان باہر سے منگا سکتا تھا - منرو بھی اس بات پر پیچ و تاب کھاتا ہُوا لِکھتا ہے:

"اگر ہم ناقابلِ تصور مصالح کی بنا پر ٹیپوؔ سُلطان کی تباہی

کے لئے تیار نہیں ہیں تو کم ازکم ہمیں یہ تو کرنا چاہیئے کہ اس سے ملیبار کا ساحلی علاقہ چھین لیں اور اسے کمزور کر دیں۔ اس طرح وہ تمام فرنگستانی طاقتوں کے ساتھ تعلقات بحال رکھنے کا واحد وسیلہ کھو بیٹھے گا۔ بعد ازاں اس کا سیاسی اور فوجی نظام خود اس کی زندگی میں خواہ باقی رہے لیکن اس کے جانشین کے ماتحت بالکل بے رُوح رہ جائے گا۔"

ان اقتباسات کا آئینہ سامنے رکھ کر دیکھئے کہ کیا صرف ٹیپو سلطان انگریزوں کا مخالف تھا اور کیا انگریز اس کے بدرجہا زیادہ یا کم ازکم اتنے ہی مخالف نہ تھے؟

کمپنی کی پیش دستی:

واقعات سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ کمپنی کے کارپردازوں نے مخالفت کا کوئی سازگار موقع بے استفادہ نہ چھوڑا۔ مثلاً نظام کے ساتھ ۱۷۶۸ء میں ایک معاہدہ کیا گیا تھا جس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ حیدر علی غاصب اور باغی ہے اور اس کی سلطنت مسخر کرنی جاسئے۔ ۱۷۶۹ء میں پہلی جنگِ میسور کے بعد حیدر علی سے معاہدہ کر لیا گیا اور اس کے تمام مقبوضہ علاقوں پر اُس کا حق مان لیا گیا۔ دُوسری جنگِ میسور کے خاتمہ پر ٹیپو سلطان کیساتھ ۱۷۸۴ء میں معاہدہ منگلور کیا گیا۔ ۱۷۸۹ء میں میر عالم حیدر آبادی نے کلکتہ پہنچ کر لارڈ کارنوالس کے ساتھ علاقہ گنٹر کے متعلق گفت و شنید کی تو اس میں ۱۷۶۸ء کے معاہدے کی تمام دفعات کی تکمیل پر بھی زور دیا

جس میں تسخیرِ میسور بھی شامل تھی - لارڈ کارنوالس نے یہ کچھ مان لیا اور ایک خط میں نظام کو اس کی اطلاع دے دی - اسی خط کو آگے چل کر پارلیمنٹ کی منظوری سے معاہدے کا درجہ حاصل ہو گیا۔ کمپنی اس سے پہلے دو مرتبہ معاہدے کی خلاف ورزی کر چکی تھی - لارڈ کارنوالس نے نظام کی امداد کے لئے فوج بھیجنے کا اقرار کیا تو اس میں تصریح کر دی کہ یہ فوج انگریزوں کے حلیفوں کے خلاف استعمال نہ کی جائے گی اور حلیفوں میں "پیشوا" رگھوجی بھونسلا، مادھوجی سندھیا دُوسرے مرہٹہ سردار، نواب ارکاٹ، نواب وزیرِ اودھ، راجہ تنجور اور راجہ ٹراونکور" سب شامل تھے - صرف ٹیپوُ سلطان شامل نہ تھا - حالانکہ ۱۷۸۴ء میں اس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ سُلطان کی طرف سے اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوئی تھی اور انگریزوں کے ساتھ تعلّقات فی الجملہ خوشگوار تھے - کم از کم ناگوار تو قطعاً نہ تھے - ولکس نے بالکل دُرست لکھّا ہے :

"توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ ٹیپوُ سلطان ان حلیف سلطنتوں کی فہرست میں جنھیں (کارنوالس) نے حملے سے محفوظ قرار دیا تھا، اپنا نام شامل نہ ہونے کو محض لغزشِ قلم کا نتیجہ قرار دے گا"
(ولکس کی تاریخِ میسور - جلد دوم صفحہ ۱۴۰)

یقیناً یہ لغزشِ قلم نہ تھی بلکہ مُدبرِ عالم حیدر آبادی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں کی ارادی حرکت تھی - یہ حرکت بھی اسی حقیقت کا ثبوت تھی کہ کمپنی کے کارندے سلطان کے سخت مخالف تھے اور ہر اچھا موقع دیکھ کر مخالفت کے اظہار میں بے باک ہو جاتے تھے - تیسری جنگِ میسور کے

اسباب آغاز پر غور و فکر کے سلسلے میں یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ کارنوالس یکم جولائی ۱۷۸۹ء کے مکتوب (موسومہ نظام) میں ۱۷۸۴ء کے معاہدۂ منگلور کی خلاف ورزی کر چکا تھا۔ سلطان نے ۲۸ یا ۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء کو ٹراونکور پر حملہ کیا۔

لارڈ ویلزلی کے بیانات:

اب تک آپ نے صرف سر ٹامس منرو کے بیانات سُنے ہیں، اب چند اقتباسات لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کے مراسلات (ڈسپیچز) سے بھی ملاحظہ فرمائیے:

لارڈ ویلزلی راس اُمید کے راستے ہندوستان آیا تھا اور اُس نے چند روز راس اُمید میں گزارے تھے۔ جہاں اسے میجر کرک پیٹرک سے ہندوستان کے حالات معلوم ہوئے۔ ۲۸ فروری ۱۷۹۸ء کو اس نے جو مراسلہ ڈائرکٹرانِ کمپنی کے صدر کے نام بھیجا۔ اس میں بھی ٹیپو سلطان کی مخالفت اور اس کی طاقت و قوّت پر بے اطمینانی کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ہندوستان پہنچ کر اس نے دکن کے متعلق جتنے مراسلات بھیجے، وہ سب اسی قسم کے مطالب سے لبریز ہیں، پھر اس نے ہر چھوٹی بڑی طاقت سے بات چیت کی اور اسے ہموار کیا۔ دولت راؤ سندھیا اس زمانے میں گوالیار کو چھوڑ کر دکن پہنچا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے نظام اور پیشوا دونوں ہراساں تھے۔ ویلزلی لکھتا ہے:

"اس طرح سندھیا درحقیقت ٹیپو کی نہایت بے بہا خدمت انجام دے رہا

ہے اور ہمارے دفاعی اتحاد (یعنی مرہٹوں اور نظام کے ساتھ) کی حقیقی غرض کو فنا کر رہا ہے "

سلطان کو بے دست و پا بنانے کی تجویز:

ویلزلی نے سلطان کو بے دست و پا بنانے کی جو تجویزیں سوچی تھیں ان کا خلاصہ یہ تھا:

(۱) ملیبار میں اس کے قبضے میں جتنا ساحلی علاقہ ہے چھین لیا جائے تاکہ فرانسیسیوں کے ساتھ اس کے تمام بحری تعلقات منقطع ہو جائیں۔

(۲) جنگ کا سارا خرچ اس سے وصول کیا جائے۔

(۳) اسے مجبور کیا جائے کہ ایک مستقل برطانوی ریذیڈنٹ اپنے پاس رکھے۔

(۴) جتنے فرانسیسی اس کی ملازمت میں ہیں ان سب کو برطرف کر دیا جائے۔

ملیبار کا ساحلی علاقہ کمپنی کے تمام کارکنوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ آپ ٹامس منرو کا بیان اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ویلزلی نے بھی اپنے ڈسپیچز میں کئی مرتبہ اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

"ہندوستان میں کمپنی کا مفاد اس وقت تک محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ٹیپو سلطان کے پاس فرانسیسی حکومت کے ساتھ نامہ و پیام کے لئے سمندر کا ذریعہ موجود ہے۔ اس کے پاس ساحلِ ملیبار کا جو علاقہ ہے وہ جنگ کا سب سے بڑھ کر مؤثر حربہ ہے میری قطعی رائے ہے کہ سب سے پہلا موقع ہاتھ آنے پر اُسے (سلطان کو) دشمن کے اس خوفناک وسیلے سے محروم کر دیا جائے"

سُلطان کی طاقت سے عداوت:

ویلزلی کو اس بات کا سخت رنج تھا کہ نظام اور مرہٹے تو آپس میں لڑتے بھڑتے رہے لیکن ٹیپوُ سلطان اپنے وسائل کی دُرستی، مالیہ کی اصلاح اور فوجی نظم کی تقویت میں مصروف رہا۔ اسی وجہ سے کمپنی کے کارکنوں کا جذبۂ مخالفت تیز تر ہوتا گیا۔ ایک جگہ ویلزلی مرہٹوں اور نظام کی کشمکشوں کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:

> "عام بدنظمی کے اس ہنگامہ زار میں سلطان کی طاقت ہر اختلال ونقصان سے محفوظ رہی ہے، حالانکہ اس کی طاقت کو دبائے رکھنا ہمارے تمام معاہدوں اور متحدہ کارروائیوں کا حقیقی مقصد ومدعا تھا۔"

گویا ٹیپوُ سلطان اگر اعلیٰ درجے کا منتظم، فوجی تنظیمات کا ماہر، مُلکی نظم و نسق میں برتر اور پُرجوش، ہوشمند، باخبر اور ہردلعزیز فرمانروا نہ ہوتا تو انگریزوں کو اس سے کوئی پرخاش نہ تھی وہ بعض دوسرے فرمانرواؤں کی طرح اسے بھی گوارا کر لیتے جیسے کہ نظام کو یا بعض مرہٹہ سرداروں کو گوارا کر لیا گیا اور ان کی مستقل حکومتیں آگے چل کر ریاستیں بنا دی گئیں لیکن ٹیپوُ سلطان کے لئے نہ یہ ممکن تھا کہ اپنے طبعی محاسن وفضائل کو معطّل رکھے، نہ اس کی عالی ہمتی اس بات کے لئے تیار ہو سکتی تھی کہ اجنبی اقتدار کے پھیلاؤ کا ایک بے رُوح ذریعہ بنا رہے۔ اس کے یہی نادر کمالات ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کی نظروں میں انتہائی عداوت وعناد کے محرّک بن گئے۔

کمال وجہ عداوت بن گیا :

مَیں نے صرف بعض شواہد پیش کئے ہیں ۔ اس موضوع پر مختلف انگریزوں کے بیانات جمع کئے جائیں تو شاید ایک ضخیم رسالہ بن جائے لیکن ان چند شواہد سے آپ کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ آگیا ہے، بلاشبہ ٹیپو سلطان اجنبی اقتدار کا سخت مخالف تھا لیکن انگریز بھی اس کے دوست اور محب نہ تھے بلکہ اُسے قابل ترین مُلکی فرمانروا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ بے دست و پا اور کمزور بنانے کی فکر میں تھے، اِس لئے کہ انھیں یقین تھا کہ ٹیپو سلطان ہی انگریزی اقتدار کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے اور اسی کی شخصیت میں ایسے جوہر موجود ہیں کہ وہ موقع پر دیسی حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائے تو انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کر دینا ناممکن نہ رہے گا۔

ہندوستانیوں اور خصوصًا مسلمانوں نے

نہ صرف ٹیپو کو اپنے قومی ہیروؤں ہی میں جگہ نہ دی

بلکہ

انگریزوں کے تتبع میں اپنے کتوں کو بھی ٹیپو کہہ کر پکارا۔

"تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو"

مُسلمانوں کے قومی ہیرو

(جناب مولینا نصر اللہ خان عزیزؔ)

سُلطان ٹیپُو کی شہادت پر آج ڈیڑھ سو برس گزر رہا ہے۔ اس طویل مدت میں جو ابنِ آدم کی چار نسلوں پر حاوی ہے اور جس میں دُنیا کا ہر مُلک، اور زمانے کی ہر قوم درجنوں انقلابات سے رُوشناس ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے مُسلمانوں پر ایک ذہنی انقلاب بھی نہیں آیا۔ فی الحقیقت یہ جمُود و بے حسّی ہندوستان کے مُسلمانوں جیسی عظیم الشّان قوم کے لئے نہ صرف شرمناک ہے بلکہ حیرت انگیز بھی۔ جس قوم کا ماضی بعید عرب کے غیوّر مسلمانوں سے وابستہ ہے۔ جو خودداری اور احساسِ نفس کے اعتبار سے دُنیا کے بلند ترین انسان تھے اور جس قوم کا ماضی قریب ہندوستان کے افغانوں اور مغلوں

کی باجبروت حکومتوں سے پیوستہ ہو، جنھوں نے سات سو برس تک مسلسل اس ملک پہ کوسِ حکومت بجایا ہو۔ ان کا انقلاباتِ زمانہ سے ایک طرف اتنا متاثر اور مرعوب ہونا کہ اپنی تمام روایاتِ ماضی کو بھول جانا اور دوسری طرف جمود و بے حسّی کا اتنا مظاہرہ کرنا کہ محکومی کے ماحول سے اپنے ذہنوں کو آزاد نہ کرنا انسانی فطرت کے اعتبار سے ایک نہ سمجھ میں آنے والا راز ہے۔

حکومت اور محکومی، آقائی و غلامی انسانی تاریخ کے معمولی سوانح اور انقلابات ہیں۔ بالکل اسی طرح معمولی جس طرح لیل و نہار کا تغیّر۔ موسموں کی تبدیلی اور گرمی اور سردی کا پے بہ پے آنا اور جانا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ جب رات کے بعد دِن یا دِن کے بعد رات کے آجانے سے ہم بدحواس نہیں ہو جاتے اور موسمِ گرما کے بعد موسمِ سرما کے وُرود سے ہم عقل و ہوش نہیں کھو بیٹھتے تو حکومت و فرمانروائی کے تخت سے غلامی و محکومی کے فرش پر گر جانے کے باعث ہم اپنی قومی خصوصیات انسانی شرافت اور اِسلامی غیرت سے کیوں محروم ہو جائیں!

محکومی بہت بڑی مصیبت ہے لیکن اس پر قناعت اس سے زیادہ بڑی ہلاکت۔ جِسموں کا مغلوب ہو جانا خدا دوست کو نصیب نہ کرے، لیکن ذہنوں کا مرعوب ہو جانا خدا دُشمن کو بھی نہ دے۔ اور افسوس کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو مصیبت نازل ہوئی وُہ تنہا جسموں کی مغلوبیت ہی نہ تھی،

بلکہ ذہنی مرعوبیت بھی تھی۔ یہاں تک کہ جن اولوالعزم فرزندانِ قوم و وطن نے اپنے خون سے ہمارے وطن اور قوم کی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور اپنے بال بچے، مال و دولت، عزیز و اقربا۔ اور اپنی جان تک ہمیں آزاد رکھنے کے لئے قربان کر دی ہم ان کو بھی بھول گئے۔ اور اپنے قومی بہادروں اور اپنے وطنی ہیروؤں کی صف میں سے انکو اس طرح نکال پھینکا گویا وہ ہمارے دشمن تھے اور ان سے کوئی علاقہ رکھنا بھی جرم اور گناہ ہے۔

سلطان ابوالفتح ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ جن کے "حالاتِ حیات" کا مرقع تم اس مجموعے میں پڑھو گے۔ ان کی پرجوش زندگی اور سرفروشانہ شہادت پر غور کرو اور پھر اس سلوک پر نظر ڈالو جو ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے انکے ساتھ کیا گیا۔ ہماری گزشتہ پچاس ساٹھ سال کی علمی زندگی میں قومی ہیروؤں کے جتنے تذکرے لکھے گئے کیا ان میں سلطان شہید کا نام آتا ہے؟ کیا مسلمانوں کے مصنف و مؤلف اور مؤرخ و ادیب طبقے نے کبھی اس عظیم الشان بہادر پر فخر کرنے کی طرف توجہ کی، جس نے غیر ملکی اقتدار کو روکنے کے لئے اپنی پوری زندگی مجاہدانہ سرگرمیوں میں بسر کر دی! اسکا کھانا اس پر حرام تھا۔ اس کا سونا بے چین تھا۔ اس کا آرام تلخ اور اس کے لیل و نہار کی ہر مضطرب ساعت اسی فکر میں بسر ہوتی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیلابِ اقتدار ہندوستان کی مقدس زمین پر قدم نہ بڑھائے۔ اس غرض کے لئے اس نے مرہٹوں سے نامہ و پیام کئے۔ نظام حیدرآباد کے پاس سفیر بھیجے۔ اپنے وزراء اور امراء کی

غدّاریوں کو سعادت کیا۔ خود انگریزوں سے مصالحت کی کوششیں کیں تاکہ اُس کا وطن غیروں کے اقتدار سے محفوظ رہے اور جہاں تک یہ مصیبت پھیل چکی ہے وہیں تک پھیلی رہے۔ اس نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا۔ اُس نے اپنے بچّوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قربان کیا اور بالآخر خود بھی مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔ اُس کی میّت کو دیکھ کر لارڈ ہارٹس بے اختیار پکار اُٹھا کہ:

"آج ہندوستان ہمارا ہے"!

لیکن ہندوستانیوں نے اور خصوصًا مُسلمانوں نے اس بہادر مجاہد کے ساتھ کیا برتاؤ کیا! اُنھوں نے نہ صرف اس کو اپنے قومی ہیروؤں ہی میں جگہ نہ دی بلکہ انگریزوں کے تتبّع میں اپنے کُتّوں کو بھی ٹیپو کہہ کر پکارا۔

"تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!"

اور یہ شرمناک سلوک ہم نے کچھ سُلطان ٹیپو ہی کے ساتھ نہیں کیا بلکہ ہر اس اولوالعزم جوانمرد کے ساتھ جس نے انگریزی اقتدار کی روک تھام میں حِصّہ لیا۔ گویا ہماری زندگی کا معیار انگریزی اقتدار کی خوشنودی تھی۔ جس سے وہ خُوش رہے اس سے ہم بھی خُوش ہیں، جس سے وہ ناراض رہے اس سے ہم بھی خفا۔ راج اللہ کو ہم بھُول گئے۔ حافظ رحمت خاں کو ہم نے فراموش کردیا۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت سیّد احمدؒ سے ہم روگرداں ہو گئے اور یہ سب کچھ اسلئے ہوا کہ محکومی و غلامی ہمارے دِل تک اُتر گئی اور

دماغوں میں بس گئی۔ ہم نے اتفاقاتِ زمانہ کو تقدیر کا فیصلہ اور اپنی بدعملی کے نتائج کو خدا کی مرضی قرار دے لیا۔ اقبالؔ مرحوم کا ارشاد ہے کہ ع

"اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھُولنے والی نہیں"

لیکن ہندوستان کی اُمّت تو سب سے زیادہ بھُولنے والی نکلی۔ وہ انقلابِ حکومت سے اتنی مرعوب ہوگئی کہ اپنا سارا ماضی بھُول گئی اور اگر نہ بھُول سکی تو اس نے ظاہر یہی کیا کہ وہ بھُول گئی ہے اور یہ سب کچھ اس طبقہ اولیٰ کی طرف سے ہوا جو قوم کے دماغ کی حیثیت رکھتا تھا یعنی علمی طبقہ جس کے دوشِ ہمّت و احساس پر قومی زندگی کے استحکام کی ذمّہ داری تھی۔

کہا جا سکتا ہے کہ محکومی و زیردستی کا وہی نتیجہ نکلا کرتا ہے جو یہاں ہوا لیکن کیا ہندوستان کے مسلمان ساری دُنیا کے انسانوں سے کوئی انوکھی مخلوق ہیں۔ کیا دُوسری اقوام پر محکومی کے دَور نہیں آئے؟ کیا خود ہندوستان میں ہمارے ہمسائے بھی مصیبت و ادبار کی اس کشتی میں سوار نہیں ہیں جس میں ہم سوار ہیں، پھر کیا انھوں نے بھی انقلابِ زمانہ کی سختیوں پر قناعت کر لی اور اپنے ان ہیروؤں سے مُنہ موڑ لیا جنھوں نے وقت کی تقدیر کا مقابلہ کرنے میں اپنی جانیں دے دیں کیا سیواجی کو وہ اسلئے بھُول گئے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اور ان کے جانشین اس کو دوست نہیں رکھتے تھے۔ کیا مہارانا پرتاپ کو انھوں نے فراموش کاری کے قعرِ عمیق میں اسلئے دفن کر دیا کہ وہ راجپوتوں کے اقتدار کی واپسی کیلئے جدّوجہد کرتا ہوا ختم ہو گیا۔ کیا اُنھوں نے تانتیا بھیل کے افسانے نہ لکھّے۔ کیا انھوں

نے تاننتیا ٹوپی کو زندۂ جاوید نہ بنایا۔ انتہا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کی فرسودہ رگوں میں حیاتِ نو کا خون دوڑانے کے لئے "حقیقت رائے" کے افسانے تراشے۔ لیکن مسلمانوں نے ہر اُس بہادر سے دست کشی اختیار کر لی جس کو غیر ملکی اقتدار نے ناپسند کیا اور انھوں نے اس کا نتیجہ بھی بھگت لیا۔ آج اُن کے منجمد خون کو گرمانے کے لئے ماضی کا کوئی ہیرو نہیں رہ گیا۔ لے دے کے سر سیّد احمد خاں مرحوم ہیں، جن کی تعلیمی خدمات کا انکار نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن کیا سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہمارے کسی درد کی دوا ہیں؟ کیا قربانی و سرفروشی اور عزم و ہمت میں بھی وہ ہمارے لئے کوئی مشعلِ راہ رکھتے ہیں؟

لیکن ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ماضی کی سرگرانیوں پر ملامت ہو چکی اب نیا دور آ رہا ہے۔ ہمارے مسلمان نوجوانوں کے سینوں میں احساسِ غیرت کی بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ وہ زمانے کی بھلا دینے والی آغوش میں سے اپنے قومی ہیروؤں کو نکال نکال کر دنیا کے سامنے اور اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ سلطان ٹیپو شہید ڈیڑھ سو برس تک معروفِ خواب رہے۔ اب ان کو پھر بیدار کیا جا رہا ہے اور ان کے کارناموں سے قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم لہو دوڑایا جا رہا ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہے۔ یہ نشاۃ الثانیہ کا نشان ہے۔ مرعوبیت دور ہو رہی ہے۔ جمود کے طلسم ٹوٹ رہے ہیں۔ محکومی کا افیونی نشہ اعصاب سے رخصت ہو رہا ہے۔ ہم

اپنے شاندار ماضی پر پھر فخر کرنے لگے ہیں اور حال کی بے حِسّی کو دُور کرکے مستقبل کو شاندار بنانے کا عزم کر رہے ہیں۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارا ہیرو وُہ ہے جو ہمارے لئے جان دے اور ضروری نہیں کہ اس سے انگریز مؤرّخ بھی خوش ہو۔

قصرِ سُلطانی کے ایک وسیع کمرے میں.

ایک نہایت خُوبصُورت قالین بچھا ہُوا تھا۔ قالین پر نہایت خوبصُورت جھاڑی بنی ہُوئی تھی جس میں گلاب کے پھُول کِھلے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک زبردست شیر آرام سے بیٹھا ہُوا تھا۔ اس جھاڑی کے پیچھے ایک شکاری ہاتھ میں بندوق لئے شیر کی تاک میں کھڑا تھا۔ اُس کے سر پر فرنگی ٹوپی تھی۔

ایک خُدا منش فقیر نے

قالین دیکھ کر پیش گوئی کی کہ :

سلطان (ٹیپو) کی

قِسمت

اِس قالین پر نقش ہے

ٹیپو سلطانؒ اور ایک نجومی

جناب محمود خان صاحب محمود بنگلوری

(مصنف تاریخ سلطنتِ خداداد میسور)

۱۸۷۴ء کے مارچ کے مہینے کی ایک سہانی صبح ہے۔ عروس البلاد سرنگا پٹم کے درو دیوار آفتاب کی سنہری شعاعوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ رگناتھ جی کے مندر کے کلس کے پہلو بہ پہلو قصرِ سلطانی کے کلس بھی دھوپ میں جگمگا کر ہندو مسلم اتحاد اور شہنشاہ ٹیپو سلطان کی رواداری کا روح پرور نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ وہ دن تھے کہ سلطنتِ خداداد کا آفتابِ اقبال جنوبی ہند پر اپنی پوری تابانی کے ساتھ ضوفگن تھا۔ شہنشاہ ٹیپو سلطان کا غلغلہ ہندوستان اور ایشیا سے نکل کر یورپ تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں انگریزوں اور نواب حیدر علی کے

درمیان جس جنگ کا آغاز ہوا،" اس کا خاتمہ ۱۷۸۲ء میں عہدنامہ بنگلور پر ہوا۔ جس میں شہنشاہ ٹیپو سلطان فاتح و منصور ہو کر نکلا بنگلور (کوڈیاں بندر) کا محاصرہ اور اس کی فتح ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری پر ایک ایسی ضرب کاری تھی کہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کانپ اُٹھے۔ لندن میں صفِ ماتم بچھ گئی اور انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اس ملک سے ان کی تجارت کی اُمیدیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ہاں تاریخ ہند کی چند ایسی ہستیاں تھیں جنھوں نے اغیار کو اس ملک میں اِس اُمید پر ٹھہرائے رکھا کہ جو چیز آج بزورِ شمشیر حاصل نہیں ہوتی وہ کل غداریوں اور سازشوں کے ذریعے خود بخود مل جائے گی۔ اسی بھروسے پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس کی تجارت پر قناعت کر لی اور بظاہر خاموش بیٹھ رہی۔

جنوب کے اس باجبروت شہنشاہ کا خاصہ تھا کہ صبح سویرے تلاوتِ قرآن اور نماز سے فارغ ہو کر تفریح کے لیے نکل جاتا تھا، ایسے موقعوں پر باڈی گارڈ کے دو افسر ہمیشہ سلطان کے ساتھ کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔

آٹھ بجے کا وقت ہے۔ شہنشاہ تفریح سے واپس ہو رہا تھا کہ اس سڑک پر جو رگناتھ جی کے مندر سے موتی محل کی جانب مڑتی تھی۔ اس کو چند آدمی نظر آئے جو ایک فقیر کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ سلطان نے مڑ کر دیکھا۔ باڈی گارڈ کا ایک افسر گھوڑے کو ایڑ لگا کر بالکل قریب آ گیا۔ سلطان نے اُس سے دریافت کیا:۔

"راجم خاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

راجہ خاں "ظل اللہ! کوئی نجومی ہے جس کو لوگ اپنا اپنا ہاتھ دکھلا رہے ہیں"
سُلطان "کیا تمھیں نجوم پر اعتقاد ہے؟"

راجہ خاں گھبرا گیا۔ اس سے جواب نہ بن سکا۔ اس کی نظریں نیچی ہوگئیں۔ سلطان نے ہلکی گرجدار آواز میں کہا۔ "جواب!"

راجہ خاں ایک نومُسلم تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کو نجوم پر اعتقاد نہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ شریعت پناہ شہنشاہ کو نجوم پر اعتقاد ہو۔ لیکن اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"نجوم ایک علم ہے اور اس کی حقیقت اُنہی لوگوں کو معلوم ہے جو اس میں مہارت رکھتے ہیں"

شہنشاہ کو اس غیر ذمہ دارانہ جواب پر ہنسی آگئی لیکن اُس نے ضبط کرتے ہوئے کہا:

"اچھا اس نجومی کو محل میں پیش کیا جائے!"

یہ کہتے ہوئے سُلطان اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ راجہ خاں نجومی کے پاس پہنچا۔ یہ ایک خستہ حال فقیر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بانس کا عصا تھا اور دُوسرے ہاتھ میں ایک لڑکے کا ہاتھ تھا جس کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔ راجہ خاں کے پہنچتے ہی لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی اس نے تحکمانہ لہجہ میں زور سے کہا:

"شہنشاہ نے تجھے محل میں فوراً آنے کے لئے کہا ہے!"

نجومی کو اس بےجا دخل دہی پر غصہ آگیا۔ اُس نے نفرت بھری نگاہوں سے

راجہ خاں کی طرف دیکھا اور کہا:

"شہنشاہ سے جا کر کہو کہ فقیر بھی اپنے دِل کا مالک ہے۔"

راجہ خاں کا سارا رُعب و دبدبہ اور غرُور خاک میں مل گیا۔ اس کو بیحد غصہ آیا لیکن اُس وقت وُہ مجبور تھا اسلیے جبر سے نہ کام لیا مبادا فقیر بالکل برافروختہ ہو جاتے اور آنے سے انکار کر دے۔ کچھ سوچ کر وہ فوراً گھوڑے سے اُتر آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:

"بندہ حُکم کا تابع ہے۔ شہنشاہ نے آپ کو طلب کیا تھا تعمیلِ حُکم میں دیر ہو تو شہنشاہ کی خفگی کا خوف ہے۔ بندہ پروری ہو گی اگر آپ میرے ساتھ محل میں چلیں۔"

نجومی نے کہا۔ "اچھا ٹھہرو! ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وُہ لڑکے کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا:

"بڑا خوش قسمت! دُنیا میں نام اور عزّت پیدا کرے گا۔"

ان الفاظ کو سُنکر لڑکے کا بُوڑھا باپ بہت ہی خوش ہوا اور جُھک کر فقیر کے پاؤں چُومنے لگا۔ فقیر اسی طرح ہاتھ دیکھنے میں مصرُوف تھا۔ کُچھ دیر بعد پھر اُس نے کہا:

"وطن، عین جوانی میں میدانِ جنگ میں مارا جائے گا۔ اس کا نام پردیس میں ہو گا۔ یہاں اِس کے نصیب میں کُچھ نہیں۔"

وہی باپ جو ایک لمحہ پہلے خوشی میں دیوانہ ہو رہا تھا اب تصویرِ حسرت بن گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے نہایت عاجزی سے کہا:

"مہاتما! ایسا نہ کہیئے۔ پردیس کی عزت اور دولت سے بہتر ہے کہ یہ وطن میں فقیر ہو کر جیئے۔

"مہاراج! تقدیر آپ کے ہاتھ میں ہے، دعا کیجئے کہ اِس کی عمر بڑی ہو۔" فقیر خاموش کھڑا تھا۔ بوڑھا باپ پھر ایک بار اس کے قدموں پر جھک گیا۔ "آہ! مہاراج! یہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اِسکی قسمت بدل دیجیئے۔"

فقیر کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے حقارت سے کہا۔ "دیوانے! قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا۔ مَیں کیا اور میری حقیقت کیا۔ بوڑھا اور ذلیل ہو کر کُتّے کی زندگی بسر کرنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ ناموری پیدا کر کے عین جوانی میں مر جائے۔" یہ کہتے ہوئے فقیر راجہ خاں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

سُلطانی محل کے ایک وسیع کمرے میں ایک خُوشنما قالین اور ایک نہایت آرام دِہ صوفہ پڑا ہوا تھا۔ فقیر آتے ہی اس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ شاہی خدّام فقیر کی اس بے باکی پر متحیّر اور دم بخود تھے۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ فقیر سے کچھ بولے۔ تھوڑی دیر کے بعد شہنشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے باڈی گارڈ کے افسر تھے۔ سُلطان کے اندر داخل ہوتے ہی خدّام جھک کر آداب بجا لائے اور اشارہ پاکر باہر چلے گئے۔ فقیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اُسکی نظر قالین پر جمی ہوئی تھی۔ وُہ حیرت سے اسکے نقش و نگار اور گل بُوٹے دیکھ رہا تھا معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے ایسی بھاری قالین عُمر بھر نہیں دیکھی تھی۔ فقیر کا ایک پاؤں ٹخنوں تک قالین میں دھنسا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت خوب صُورت

جھاڑی بنی ہوئی تھی جس میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک زبردست شیر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں میں چھپا ہوا ایک شکاری بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے شیر کو تاک رہا تھا۔ شکاری کے سر پر فرنگی ٹوپی تھی۔ شیر اس سے بالکل بے پروا تھا۔ اس نظارے پر فقیر کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں کہ سلطان بالکل قریب آ گیا۔ فقیر کی نظر اٹھی اور اس نے اٹھتے ہوئے کہا کہ آئیے بیٹھیے۔ گویا یہ اس کا خاص کمرہ ہے، اور سلطان کے باڈی گارڈ کے افسر حیرت سے فقیر کو دیکھنے لگے۔

سلطان اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر فقیر بیٹھا تھا۔ سلطان نے کہا۔ "سلطنتِ خداداد کی سیاحت میں آپ نے کیا دیکھا؟"

فقیر:۔ "رعایا نہایت خوش و خرم ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں آرام سے ہیں اور دونوں میں سگے بھائیوں کی سی محبت ہے۔" فقیر یہاں رک گیا اور سلطان کے چہرے کو دیکھا تو خوشی سے چمک رہا تھا۔ فقیر نے پہلو بدلا اور کہنے لگا۔ "اگر شہنشاہ کی عدل گستری اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ یہی یکساں سلوک رہا تو شہنشاہ کا پرچم اقبال تمام ہند پر لہراتا نظر آئیگا۔ خدا ایسے عادل و رحمدل شہنشاہ کو عمرِ خضر عطا فرمائے اور اس کا سایۂ عاطفت ہم جیسے فقیروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔"

فقیر کی گفتگو میں خوشامد کا پہلو تھا۔ فقیر کی نظر دوبارہ شہنشاہ کے چہرے کی طرف اٹھی۔ اس وقت وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں سلطان نے کہا۔ "علم نجوم کے متعلق کچھ کہیے۔ کیا یہ علم صحیح ہے؟"

فقیر۔ "صحیح اور بالکل صحیح ہے۔ لیکن صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ دھوکہ بازوں نے اپنے فائدے کے لئے اس کو بدنام کر رکھا ہے۔"

سلطان نے اپنے باڈی گارڈ کے افسر کی طرف دیکھا اور وہ باہر چلا گیا۔ سلطان اور فقیر دونوں خاموش تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی افسر ایک طلائی پنجرہ لے کر آیا جس میں ایک طوطا بند تھا۔ افسر کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی چاقو لئے ہوئے تھا۔ سلطان نے پنجرے کا دروازہ کھول کر پرندے کو اس طرح ہاتھ میں پکڑ لیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں سلطان کی مٹھی میں تھیں اور پر کھلے ہوئے۔ طوطا پھڑپھڑانے لگا۔ سلطان نے سپاہی کے ہاتھ سے چاقو لیتے ہوئے نجومی سے کہا۔ "بتاؤ اس طوطے کی قسمت میں کیا ہے؟"

فقیر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "ایک کاغذ اور قلم!"

سلطان کے حکم پر یہ دونوں چیزیں آگئیں۔ فقیر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور لپیٹ کر دوسری جانب پھینکتے ہوئے کہا۔ "اب آپ جو چاہیں کریں۔"

سلطان کا وہ ہاتھ جس میں چاقو تھا بلند ہوا اور نہایت زور کے ساتھ پرندے پر اترا۔ پرندہ جان کے خوف سے بہت زیادہ پھڑپھڑانے لگا۔ اس کشمکش میں گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پرندہ ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا اور چاقو سلطان کے ہاتھ پر لگا۔ ہاتھ سے خون بہنے لگا۔ پرندہ آزاد ہوتے ہی کمرے میں دو ایک چکر لگا کر دریچہ سے باہر اڑ گیا۔

باڈی گارڈ کا افسر سلطان کے اس زخم کو دیکھ کر گھبرا گیا اور فوراً جا کر شاہی طبیب کو لے آیا۔ سلطان نے نہایت اطمینان سے اس کی طرف ہاتھ

بڑھاتے ہوئے حکم دیا کہ کاغذ اُٹھایا جائے۔ کاغذ میں لکھا تھا۔ "تم اس پرندے کی جان نہیں لے سکتے۔ خدا کی یہ مخلوق بھی اسی طرح آزاد ہے جس طرح تم آزاد ہو، اس کے چوٹ بھی نہ آئے گی لیکن تم خود نقصان اُٹھاؤ گے۔"

سُلطان سراپا حیرت بن گیا۔ ابھی اس کی حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فقیر اُٹھ کر چلنے لگا۔ سُلطان بھی ساتھ ہی اُٹھا اور نہایت مِنّت سے کہنے لگا۔ "سائیں جی! کچھ اپنی قسمت بھی بتا دیجئے۔" فقیر پلٹا اور کہنے لگا:
"شہنشاہ کی قسمت؟ وہ اِس قالین پہ نقش ہے!"

ٹیپو

ہندوستان کو آزاد، فارغ البال،
اور متحد دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے
غلامی کو منسوخ کیا۔ زرعی نظم و
نسق میں انقلاب آشنا اصلاحات
نافذ کیں اور مُلک کے نظم و
نسق میں رعایا کو حصہ دینے کیلئے
ایک پارلیمنٹ قائم کی

سُلطان ٹیپُو کی غیر مُلکی استعمار دُشمنی

(کامریڈ فیروز الدین منصُور)

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد دربارِ دہلی یعنی جاگیر شاہی ملوکیت (FEUDAL IMPERIALISM.) کے خلاف دیسی جاگیر شاہی (INDIGINIOUS FEUDALISM) کی بغاوتوں سے سلطنتِ مغلیہ کی بیخ و بنیاد لرز رہی تھی۔ تمام مُلک ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک لُوٹ مار، قتل و غارت گری کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ زراعت، صنعت اور تجارت تباہ ہو رہی تھی۔ گھر بار، عزّت و ناموس، غرضیکہ کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ نظام حیدرآباد کی سلطنتِ مغلیہ کے خلاف سازشوں، مرہٹوں اور نظام کی معرکہ

آرائیوں، بنگال میں میر جعفر اور میر قاسم کی ریشہ دوانیوں اور نواب کرناٹک کے خواب آزادی ۔ ان تمام واقعات اور اُن کے منطقی نتائج نے بی۔ غیر ملکی تاجروں کے لئے ایک وسیع اور کھلا میدان مہیا کر دیا تھا ۔ چنانچہ وہ ہندوستان کی افراتفری سے فائدہ اُٹھانے کے لئے راجاؤں اور نوابوں کو ایک دوسرے کے خلاف اُبھار کر اور مال و زر کے عوض ایک دوسرے کے خلاف فوجی امداد دے کر اُنھیں کمزور کر رہے تھے اور رفتہ رفتہ مُلک پر خود قابض ہو رہے تھے ۔

یہ تھے وُہ اندوہناک حالات اس مُلک کے جس میں اپنے والد سلطان حیدر علی کی وفات کے بعد ابوالفتح ٹیپو سلطان نے ۱۷۸۲ء میں میسور کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی ۔

ٹیپو سُلطان ہندوستان کو فارغ البال، آزاد اور متحد دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے مُلک کے نظم و نسق میں رعایا کو حصّہ دینے کے لئے پارلیمنٹ قائم کی ۔ غلامی کو منسوخ کیا ۔ زرعی نظم و نسق میں انقلاب آشنا اصلاحات نافذ کیں ۔ تجارت کو فروغ و ترقی دینے کی کوشش کی اور اس غرض سے سلیم خاں سلطان ترکی کو تجویز بھیجی کہ وُہ بندرگاہِ بصرہ میں حکومتِ میسور کو ایک تجارتی کوٹھی کھولنے کی اجازت دے اور اس کے عوض حکومتِ ترکی اپنی ایک تجارتی کوٹھی منگلور میں کھول لے ۔ شاہِ ایران کو بھی ٹیپو سلطان نے اس قسم کی تجویز بھیجی اور بندرگاہِ بوشہر میں ایک تجارتی کوٹھی کھولنے کی اجازت مانگی مگر افسوس کہ تمام ایشیا پر زوال کے بادل منڈلا رہے تھے ۔ شاہِ ایران نے

بالکل توجہ نہ کی اور سلطان سلیم نے اس تجویز کا مضحکہ اُڑایا۔

سلطان ٹیپو کی وسیع النظری دیکھ رہی تھی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرقی ممالک رفتہ رفتہ مغربی ملوکیت پرستوں کے غلام بن رہے ہیں۔ اہلِ مشرق اپنی نااتفاقی کے باعث کمزور ہیں۔ موجودہ حالات میں فرداً فرداً مغربی استعمار پرستوں کے ارادے اور منصوبے ناکام نہیں بنائے جا سکتے چنانچہ اُس نے مشرق کی زوال پذیر سلطنتوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے اُن میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس غرض سے زمان شاہ والی افغانستان، کریم خاں (ژند) فرمانروائے سلطنتِ ایران اور سلطان سلیم فرمانروائے سلطنتِ عثمانیہ سے خط و کتابت کی مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

سلطان ٹیپو نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نااتفاقی کو مٹانے اور غیر ملکی استعمار پرستوں کے خلاف تمام ہندوستان کو متحد کرنے کی بھی انتہائی کوشش کی۔ اُس نے اپنے ہر محکمے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی رکھا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ کنڑی دفتر بھی قائم کیا اور سلطان وزیروں کے ساتھ ساتھ ہندو وزیر بھی رکھے۔

غیر ملکی ملوکیت پرستوں کے خلاف متحد ہو کر جنگ کرنے کی اُس نے ہندو اور مسلمان سلطنتوں اور ریاستوں سے اپیل کی۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی رقمطراز ہے:

سلطان نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی جو سازش کی تھی۔ اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جن کی نقول

سلطان کے کتب خانے سے ملیں۔"

یہ خطوط مرہٹوں، شہنشاہِ دہلی، راجپوت حکمران بلکہ نیپال کے راجہ کو بھی لکھے گئے تھے۔ اس نے نظام حیدر آباد سے بھی رشتۂ اتحاد استوار کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے ایلچیوں کی معرفت تجویز بھی پیش کی کہ اس کے خاندان کی لڑکیاں، نظام کے بیٹوں اور بھتیجوں اور نظام کے خاندان کی لڑکیاں اس کے بیٹوں اور بھتیجوں سے بیاہی جائیں تاکہ طرفین سے ابوابِ یگانگت کشادہ ہو جائیں۔ مگر نظام نے، جس نے سلطنتِ مغلیہ کو تباہ و برباد کیا اور جو انگریزوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کر رہا تھا، اس تجویز کو قبول نہ کیا بلکہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کر دیا۔ مگر اس جری سلطان نے حوصلہ نہ ہارا اور اپنی فوجوں کو لے کر برق و باد کی طرح حیدر آبادی اور مرہٹی فوجوں پر گرا اور ایک ایسا سبق دیا کہ مرہٹے اور نظام ذلّت آمیز شکست کھا کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔

برطانوی استعمار کے خلاف ہندوستان کو متحد کرنے اور ہندوستان کی ہندو اور مسلمان ریاستوں اور سلطنتوں کا متحدہ محاذ بنانے کی کوششوں میں ناکامی کا منہ دیکھنے سے اسے مایوسی ضرور ہوئی مگر اس نے ہمّت، بہادری اور جرأت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ایک طرف نظام اور مرہٹے برسرِ پیکار تھے۔ دوسری طرف ملک کے اندر بغاوتوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان سب امور کے باوجود وہ انگریزوں سے کئی بار لڑا۔ بہادری سے لڑا، اور لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔

ٹیپو سلطان ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف وہ پہلا مجاہد تھا جس نے اہلِ مشرق اور اہلِ ہند کو متحد کرنے کی کوشش کی اور اس کی انگریز دشمنی کا اندازہ اِس نفرت سے لگایا جا سکتا ہے جو انگریزوں کو اس کی ذات سے ہے اور جس کا اظہار اکثر وہ اپنے کتوں کا نام "ٹیپو" رکھ کر کرتے ہیں۔

سُلطان کی ذات میں

خِدمتِ اسلام اور وطن دوستی کے جذبات

پُورے توازن کے ساتھ جمع ہو گئے تھے

نہ اُن کو اِسلام کی محبّت نے وطن

کی آزادی سے غافل کیا نہ

وطن کی آزادی کے شوق میں وہ

اِسلام کی خِدمت سے غافل ہُوئے

کامیاب انسان

خواجہ عبدالوحید صاحب
(سکرٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور)

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝

ترجمہ۔ اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ (حق و صداقت) میں لڑتے ہوئے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر گئے، اُنھیں مُردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔ اگرچہ ان کی زندگیوں کی حقیقتوں کو تم سمجھ نہیں سکتے ۝

انسانی زندگی کا معیارِ کامیابی اسلام کی نگاہ میں یہ نہیں ہے کہ ایک انسان اپنی منزلِ مقصود تک ضرور ہی پہنچ جائے۔ بلکہ کامیابی اس میں ہے کہ وہ منزل تک پہنچنے

کے لئے جدوجہد اور سعی وعمل میں مصروف رہے۔ اگر راہ کی دشواریاں اس کے لئے رکاوٹ پیدا نہ کریں اور گردونواح کی دلچسپیاں اس کو اپنی طرف متوجہ نہ کرلیں تو منزل کی دوری کی بنا پر اس کا راستے ہی میں رہ جانا اس کی ناکامی کی دلیل نہ ہوگا۔ اس طرح میدانِ کارزار میں ایک سچّے مسلمان کی شہادت اگرچہ اُسے فتح وظفر کے ثمرات سے محروم رکھتی ہے اور اگرچہ اس کی لاش سینکڑوں ہزاروں لاشوں کے نیچے پڑی ہو۔ لیکن قرآنِ حکیم اُسے زندہ قرار دیتا ہے۔ یعنی حق وصداقت کی راہ میں جس انسان نے اپنی حیاتِ فانی قربان کردی اس نے حیاتِ جاوداں پالی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ایک مومنِ قانت کے لئے اور کوئی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

سلطان ابُوالفتح ٹیپوُ ایسے ہی کامیاب انسانوں میں سے ایک کامیاب انسان تھے۔ اُن کی زندگی اوّل سے لے کر آخر تک جدّوجہد اور سعی وعمل کا ایک مسلسل مظاہرہ تھا۔ جب سے اُنھوں نے ہوش سنبھالا، اُن کے مقدّر میں فراغت اور فرصت کا کہیں ثبوت نہ ملا۔ زندگی کی تمام مدّت ملتِ اسلامیہ اور آزادیٔ وطن کی مسلسل جدّوجہد میں بسر ہوگئی اور فرشتۂ موت سے سامنا ہوُا تو میدانِ جہاد وکارزار میں۔ اِس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کیا کامیابی ہوسکتی ہے!

سلطان شہید کی زندگی اپنے خاندان کے لئے عیش وعشرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے وقف نہ تھی بلکہ اُنھوں نے جیسا کہ سلطانِ سلیم کی طرف ان کا لکھا ہوُا خط ظاہر کرتا ہے:۔ فی سبیل اللہ اور دینِ محمدؐ کی بنیاد قائم رکھنے

کے لئے کمر باندھی تھی۔ اسی طرح سلطانِ شہید خاکِ وطن کے حقوق کے بھی محافظ تھے۔ انھوں نے سرزمینِ ہند کی تمام قوموں کی خدمت اور انکے حقوق کے تحفّظ کو اپنے اہم ترین فرائض کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی دونوں قابلِ ذکر قوموں کو آزادی دے رکھی تھی جہاں اُنھوں نے خاکِ ہند کی آزادی کے لئے مُسلمان ریاستوں سے تعلّقات استوار کرنیکی کوشش کی۔ وہاں ہندو حکمرانوں سے بھی گہرے دوستانہ اور حلیفانہ تعلّقات قائم کرنے کی پیہم کوشش کی۔ مغربی قوموں سے اس مُلک کو نجات دلانے کے لئے اُنھوں نے ہندوستان کے تمام حِصّوں کے والیانِ ریاست سے روابط قائم کرنے کی قابلِ ستائش کوشش کی۔

سُلطان کی ذات میں خدمتِ اسلام اور وطن دوستی کے جذبات پورے توازن کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ نہ ان کو اسلام کی محبّت نے وطن کی آزادی سے غافل کیا نہ وطن کی آزادی کے شوق میں وہ اسلام کی خدمت سے غافل ہوئے، ایک طرف ان کے دِل میں اسلام کے قیام کی راہ میں ہر قربانی کا شوق تا حینِ حیات قائم رہا۔ دُوسری طرف ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں پر ان کی نوازشوں کا سِلسلہ کبھی ختم نہ ہُوا۔

ہندوستان جس سیاسی دَور میں سے گزر رہا ہے اس میں سُلطان شہید ایسے عظیم الشّان انسان کی سوانح حیات سے عوام النّاس کو رُوشناس کرانا بہترین ملّی و مُلکی خدمت ہے۔

سُلطانِ شہیدؒ

مولانا روشؔ صدیقی (جوالا پوری)

○

اے شجاعِ ازل، اے ہند کے فرزندِ جلیل
زندگی خود ہے ترے ذوقِ شہادت کی قتیل
نامرادی تری آئینِ وفا کی تکمیل

رزم آرا علمِ جیشِ صداقت تجھ سے
زندہ ہے آج بھی مشرق کی شجاعت تجھ سے

لے گئی عرشِ وفا پر تجھے تقدیر تری
گونجتی ہے ابھی آفاق میں تکبیر تری
عدل کے ہاتھ میں ہے آج بھی شمشیر تری

لبِ اقوام پہ جاری ترا افسانہ ہے
سوزِ آزادیٔ مشرق ترا پروانہ ہے

ہائے وہ منزلِ الفت سے گزرنا تیرا
حجلہ آرائے شہادت وہ سنورنا تیرا
غیرتِ عشق کے آغوش میں وہ مرنا تیرا
بزمِ امکاں پہ گراں جب تری تنہائی ہوئی　　موت آئی تجھے آغوش میں شرمائی ہوئی

تو ہے وہ بحر جو شرمندۂ ساحل نہ ہوا
وہ مجاہد ہے جو آسودۂ منزل نہ ہوا
مصلحت سے کبھی مانوس ترا دل نہ ہوا
عشق سے مرگ کے شعلوں کو بجھایا تو نے　　جاوداں ہستئ فانی کو بنایا تو نے

تری جرأت تھی غمِ سود و زیاں سے آزاد
تو رہا گردشِ دورانِ جہاں سے آزاد
ہے تری یاد زماں اور مکاں سے آزاد
باطل افگن ہے ترا نعرۂ آزاد ابھی　　ہے ترے نام سے لرزاں ستم ایجاد ابھی

ہند کو محرمِ اسرارِ وفا تو نے کیا
حقِ وفاداریٔ مشرق کا ادا تو نے کیا

پرچم افشاں علمِ دینِ خدا تُو نے کیا
حلقۂ جادوئے افرنگ کو توڑا تُو نے
ہند میں پنجۂ شیطان کو مروڑا تُو نے

حُرّیت سُرخیٔ منظم مہ و خورشید ہے پھر
انقلابات کی کچھ اور ہی تمہید ہے پھر
ہاں ترا عہدِ وفا عازمِ تجدید ہے پھر
پھر ہے بیدار جلال و حشمِ آزادی
وقت کے ہاتھ میں ہے پھر علمِ آزادی

ہند میں آج جو یہ جلوۂ بیداری ہے
سطوتِ غیر جو مجبورِ نگونساری ہے
یہ ترے شعلۂ ایثار کی گُل کاری ہے
سحرِ تکمیل ترا جذبِ تمام آپہنچا
صبحِ آزادیٔ مشرق کا پیام آپہنچا

سلطان کا مقبرہ

یہ مقبرہ سلطان نے خود بنوایا تھا۔ اس میں سلطان حیدر علی، سلطان ٹیپو اور اُس کی والدہ کی قبریں ہیں۔ مقبرے کے چاروں طرف برآمدہ ہے جو سیاہ مرمر کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ جنوبی برآمدے اور صحن میں سلطان کے اعزہ و اقربا کی قبریں ہیں۔ مقبرے کے باہر مغربی دروازے پر تاریخیں لکھی ہیں۔ ایک تاریخ یہ ہے:

ان اخذت مصر کما قد ذکرط
وسرنجفتنۂ اخذت ودبتھا
مصیبة ما مثلھا ارختھا
ذھب عزّ الروم والھند کلھا

ایک قطعے کا تاریخی مصرع یہ ہے: ع
یکے زاں میاں گفت "شمشیر گم شد"

ۓ سرنگپٹن

سُلطان ٹیپُو شہیدؒ

شہیدانِ محبّت کا امام تھا اور مشرقی ممالک کی

آبرو (آزادی) اُس کی ذات سے وابستہ تھی

آج دُنیا میں

اُس کا نام سُورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہے

اور

اُسکی قبر کی مٹی آج بھی ہندوستان کے نوکروڑ رسمی مسلمانوں

سے کہیں زیادہ زندگی کے خواص و آثار اپنے اندر

رکھتی ہے۔

سُلطان ٹیپُو شہیدؒ
(علاّمہ اقبالؒ کی نظر میں)

جناب محمد یُوسف خان سلیم چشتی۔ بی۔اے (آنرز)
"پرنسپل اشاعتِ اسلام کالج۔ لاہور۔"

یہ مضمون کسی زبردست دماغی کاوش یا صبر آزما تحقیق کا نتیجہ نہیں بلکہ اس بے پناہ محبت اور عقیدت کا ایک ادنیٰ سا نشان ہے جو مجھے سلطان ٹیپُو شہید ہی سے نہیں بلکہ ان تمام جانبازوں کے ساتھ ہے جنھوں نے باطل کا مقابلہ کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ اور اس عظیم مقصد کے حصُول کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میرے مُحبت نواز دوست مسٹر عبداللہ بٹ متعلم ایم۔اے سلمہ الرحمٰن نے مجھ سے سُلطان شہیدؒ پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی اور صرف تین دن کی

مہلت دی تو میں نے ان کی درخواست بلا تامل قبول کر لی - یوں بھی اعلےٰ پایہ کے مضمونوں کو گزندِ عین الکمال سے محفوظ رکھنے کے لئے اس قسم کے مضمون کی اشد ضرورت تھی "

سلیم چشتی

تمہید :-

علامہ اقبالؔ کے متعدد عظیم الشان احسانات میں سے اہم احسان یہ ہے کہ انھوں نے میری توجہ دُنیائے اسلام کی چند رفیع المرتبت شخصیتوں کی طرف مبذول کر دی - جس کی بدولت میری دُنیائے فکر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا -

سُلطان شہید رح کے متعلق مجھے اوّلین واقفیت اس وقت حاصل ہوئی جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا - چنانچہ مارسڈن کی تاریخ کا یہ فقرہ تو ابھی تک میرے دِل پر نقش ہے :-

"BUT TIPPU WOULD NOT AGREE."

یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے - اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں بی اے میں آ کر "ہز ماسٹرس وائس" کا دُوسرا ریکارڈ سُنا جو سائز میں سکولی ریکارڈ سے بڑا تھا لیکن حقیقت بدستور مستور رہی اور کالج کے پنجسالہ قیام میں اس فقید المثال مُسلمان کے متعلق جو کچھ سرمایہ معلومات حاصل ہو سکا - اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹیپو ایک ظالم متعصب اور خونخوار بادشاہ تھا جو ہندوؤں کو زبردستی مُسلمان بنایا کرتا تھا اور بڑا کوتاہ بین اور عاقبت نا اندیش تھا - اِسی لئے اُس نے لارڈ وِلزلی جیسے ہندوستان دوست کے مشورے کو قبول نہ کیا اور نظام علیخاں

نظام حیدر آباد کی طرح برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں آنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے بجائے (جو بادشاہوں کا مطمع نظر ہونا چاہیئے) سپاہیوں کی طرح دست بدست جنگ کرتا ہوا "مارا گیا"۔ یعنی سلطنت کے ساتھ جانِ شیریں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" شائع ہوا اور اس زندۂ جاوید نظم کی بدولت وہ پردہ جو بہ برکاتِ تعلیمِ مغرب کم و بیش بیس سال سے میری آنکھوں پر پڑا ہوا تھا، ہٹ گیا اور میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ ؎

آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب اُو بیدار بود
(اقبالؔ)

مغربی تعلیم یا بالفاظِ صحیح تر سرکاری تعلیم نے مسلمان نوجوانوں کی ذہنیت جس قدر غیر اسلامی بنا دی ہے اس پر ماتم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اقبالؔ کی بدولت میں اصلی ٹیپوؒ سے آشنا ہوا۔ اور اس لئے اس مردِ مؤمن سے ایک والہانہ شیفتگی پیدا ہو گئی۔ اس وقت سے تا ایں دم سلطان شہیدؒ کے متعلق تاریخی معلومات جمع کرنے میں مصروف ہوں اور انشاء اللہ اس کی زندگی اور اس کے کارناموں پر ایک مستقل کتاب (MONOGRAPH) سپردِ قلم کروں گا تاکہ میری قوم کے نوجوان جو حکمتِ فرعونی کی بدولت حریّت فکر و عمل سے عاری ہو چکے ہیں، بیدار ہو جائیں۔ شاید اس طرح سلطان شہیدؒ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

آغازِ کلام :-

جاوید نامہ پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ اس کتاب کے لکھنے سے علامہ رح کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے منجمد خون کو حرکت نصیب ہو سکے کیونکہ علامہ رح نے خود ایک مرتبہ بسبیلِ تذکرہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کی نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ کسی طرح ان کے خون میں حرکت پیدا ہو جائے"۔

اسی مقصد کے لئے انھوں نے جاوید نامہ میں سلطان شہیدؒ سے اپنی مثالی ملاقات کا حال قلمبند کیا ہے۔ جنّت الفردوس میں شرف النساء بیگم مرحومہ اور سید علی ہمدانی مرحوم سے ملاقات کے بعد ان کے مرشد پیر رومی رح نے انہیں محلاتِ سلاطین کی طرف متوجہ کیا اور قصرِ سلطان شہید رح کی طرف اشارہ کر کے بدیں الفاظ سلطان موصوف کا تذکرہ کیا:

آں شہیدانِ محبت را امام — آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر — خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد — تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین — فقرِ سلطان وارثِ جذبِ حسینؓ

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

یعنی اے اقبال! سلطان ٹیپو شہید رح شہیدانِ محبت کا امام تھا اور مشرقی ممالک کی آبرو (آزادی) اس کی ذات سے وابستہ تھی۔ آج دنیا میں اسکا نام سورج

اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہے اور اس کی قبر کی مٹی آج بھی ہندوستان کے نو کروڑ رسمی مسلمانوں سے کہیں زیادہ زندگی کے خواص اور آثار اپنے اندر رکھتی ہے۔

عشق ایک راز تھا لیکن سلطان شہید رح نے اس راز کو عالم آشکارا کر دیا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اے اقبال! کیا تو نہیں جانتا کہ اس نے کس سپاہیانہ آن بان کے ساتھ اپنی جان دی۔ کہ اس کے اشد مخالفین مثلاً BOWRING کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ:- "He died a soldier's death."

اگر مسلمان سلطان کی شہادت کو حضرت علی مرتضیٰ کی نگاہ سے دیکھیں تو ان کو صاف نظر آ سکتا ہے کہ سلطان شہید کا فقر درحقیقت جذبۂ حسینی کا وارث تھا۔ اگرچہ سلطان کی وفات کو ایک عرصہ دراز گزر چکا ہے لیکن ملکِ دکن میں آج بھی اس کے نام کی نوبت بج رہی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس جگہ اقبال رح کے اس مصرع کی توضیح تاریخ کی روشنی میں کر دوں: "تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد؟" کیونکہ یہ مصرع اس سارے مضمون کی جان ہے۔

لیکن اس سے پہلے اس مصرع کا مطلب بیان کرنا مناسب ہوگا۔ ؏

"خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک سیاح کسی آزاد ملک سے ہندوستان میں آتا ہے تو جب وہ ہندی مسلمان کو دیکھتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زندہ ہونے کے مدعی ہیں مگر غلام ہیں۔

یعنی اپنی نعشیں اپنے شانوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں، درا صل مُردہ ہیں لیکن فریب خوردہ ہیں اسلیئے اپنے آپ کو زندہ خیال کرتے ہیں۔

پھر جب وُہ سرنگا پٹم میں سُلطان شہیدؒ کی تُربت پر حاضر ہوتا ہے تو اُس کے دِل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس خاک میں اس مردِ غازی کے جسم کے مادی ذرات پیوستہ ہیں جو حُریت کا علمبردار تھا اور جب تک زِندہ رہا، آزادی کی فضا میں سانس لیتا رہا۔ اُس نے غلامی پر موت کو ترجیح دی۔ کیونکہ وُہ جانتا تھا، کہ آزادی سے محرُوم ہو جانے کے بعد، زندگی میں نہ کوئی لُطف باقی رہتا ہے نہ عقلمندوں کی نگاہ میں کوئی قیمت۔ کیونکہ زندگی آزادی کا دُوسرا نام ہے۔ لہٰذا یہ خاک ان انسانوں سے زیادہ زِندہ ہے جو زندہ ہونے کے باوجود مُردہ ہیں۔

باز آمدم بر سرِ مطلب، اب مَیں اس مصرعے کی وضاحت کروں گا: ؏

"تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد"

مَیں نے اُوپر لکھا ہے کہ یہ مصرعِ سارے مضمون کی جان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک انسان والہانہ انداز میں، موت سے ہم آغوش نہ ہو، اسکا نام عاشقوں کی فہرست میں درج نہیں ہو سکتا۔

سُلطان کے جان دینے کی تفصیل یہ ہے کہ جس دِن سے سُلطان رح قلعہ میں محصُور ہوا تھا۔ اس نے محل میں اقامت ترک کر کے سپاہیوں کی طرح ایک چھولداری میں رہنا اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ایک بجے دِن کے قریب وُہ فصیل سے نیچے اُترا کہ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرلے

جس وقت وہ کھانا کھانے بیٹھا تو شاید دُوسرا یا تیسرا لقمہ ہی اُٹھایا ہوگا کہ چند غدار افسر افتاں و خیزاں اُس کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ "جہاں پناہ! غنیم نے دیوار میں رخنہ کر دیا ہے اور اُس کی فوج اندر داخل ہو چاہتی ہے۔" یہ سُنکر شیر دِل سُلطان نے فوراً دستر خوان سے ہاتھ کھینچ لیا اور تلوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ غداروں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ "حضُور! انگریز بڑے شریف اور عالی حوصلہ ہیں آپ (SURRENDER) تسلیم کر لیجئے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کے ساتھ نہایت شریفانہ سلُوک کریں گے۔"

سُلطان کا چہرہ غداروں کی یہ کمینہ گفتگو سُنکر بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہوگیا اور سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ، شمشیر خارا شگاف کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر یہ زندہ جاوید الفاظ اپنی زبان حقیقت ترجمان سے ادا کیے۔ "اے نامردو! بزدلو! غدارو! شیر کی حیاتِ یک روزہ، گیدڑ کی حیاتِ صد سالہ سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔"

غدار تو اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے اور سُلطان اسی ترنگ میں گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے سے باہر نکلا۔ پھاٹک سے نِکل کر چند گز ہی گیا ہوگا کہ ایک گولی گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور وہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ سُلطان نے گھوڑے کو اسی حالت میں چھوڑا اور پیدل چل پڑا۔ تھوڑی ہی دُور گیا ہوگا کہ دُوسری گولی سُلطان کی پنڈلی میں لگی لیکن اُس نے مطلق پروا نہ کی اور آگے بڑھا تھوڑی دیر بعد تیسری گولی بائیں بازو میں پیوست ہوگئی مگر شیر کی اُٹھد پر بل نہ آیا اور مردانہ وار بڑھ کر اس جگہ پہنچا جہاں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔

غداروں نے پھاٹک کھول دیا تھا اور دشمن کے سپاہی اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلطان کو دیکھ کر اس کے جاں نثار پروانہ وار اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ یہاں تک کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

سلطان کے جسم میں دو گولیاں تو پہلے ہی پیوست ہو چکی تھیں اور کافی خون اس کے زخموں سے نکل چکا تھا۔ اس دست بدست جنگ میں متعدد زخم اسکے جسم پر آئے لیکن جب تک اس میں کھڑے ہونے کی تاب رہی، برابر اپنی جوانمردی کے جوہر دکھاتا رہا۔ حتّٰی کہ زخموں کی کثرت سے چور ہو کر گر پڑا۔ لیکن اس حالت میں بھی تلوار اس کے قبضہ میں تھی اور چتون سے وہی شجاعت ٹپک رہی تھی جو ازل سے اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی۔

جب دشمن کے سپاہیوں نے دیکھا کہ وہ شیر جس نے اپنی خداداد شجاعت اور ہنرمندی کے بل بوتے پر کرنل بیلی (BELLIE) اور کرنل بریتھ ویٹ (BRAITH WAITE) جیسے آزمودہ کار سپہ سالاروں سے ہتھیار رکھوائے تھے۔ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا ہے تو ایک سپاہی نے اس کی جواہر نگار پیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ سلطان کو اس توہین کی تاب کس طرح ہو سکتی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے تلوار کا ایک ہاتھ اس سپاہی کے رسید کیا جو اس کی ران پر لگا۔ سپاہی نے فوراً قرابین چھتیالی اور اس کی گولی سلطان کی دائیں کنپٹی پر لگ کر آر پار نکل گئی اور اس طرح اس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جس کے نام سے برسوں اس کے دشمن لرزہ بر اندام رہ چکے تھے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

زِندہ رود (اقبال) اور سُلطان کی گفتگو:

نادر شاہ ایرانی اور احمد شاہ ابدالی سے مُلاقات کے بعد، زندہ رود سُلطان شہید رح کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو سُلطان یُوں گویا ہوُا :-

باز گو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد — آنکہ اندر دیرِ او آتش فسرد
آنکہ دِل از بہرِ او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غمِ ماکُن غمِ اُو را قیاس
آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

اے اقبال! مجھے ہندوستان کی حالت سے آگاہ کر، مجھے بتا کہ میرے بعد میرا پیارا وطن اب کس حال میں ہے؟ وہ وطن، وُہ ہندوستان جس کی خُشک گھاس میری نظر میں باغ سے بھی زیادہ دِلکش تھی، وُہ ہندوستان جس کی مسجدیں اب سُنسان پڑی ہُوئی ہیں اور مُسلمانوں کی ذہنیت اِس درجہ پست ہو گئی ہے کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اِسلام ہے آزاد

(اقبالؔ)

آہ! وُہ ہندوستان جس کے آتشکدوں (مندروں) کی آگ سرد ہو چُکی ہے (یعنی وُہ بد بخت مُلک جس کے باشندے غلامی پہ رضامند ہو چکے ہیں) وُہ ہندوستان جس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے میں نے سر دھڑ

کی بازی لگادی۔ جسکی عزّت کو قائم رکھنے کے لئے اپنا سینہ چھلنی کرالیا۔ جس کی لاج رکھنے کے لئے مَیں نے خُون سے ہولی کھیلی۔ آہ! وُہ ہندوستان جس کی محبّت میں مَیں نے اپنا تخت و تاج اور نام و نشان سب کچھ قربان کر دیا۔ جس کی محبّت آج بھی میرے دِل میں رہ رہ کر چُٹکیاں لے رہی ہے۔

اے اقبال! ہندوستان کی مصیبتوں کا اندازہ اُس رنج و غم سے کر جو میرے سینے کی پہنائیوں میں آباد ہے۔ افسوس میرے مُلک کے باشندوں (ہندُو مُسلمان) نے محبّانِ وطن کی قدر و منزلت نہ پہچانی۔

زِندہ رود (اقبال) کا جواب :-

ہندیاں مُنکر ز قانونِ فرنگ

در نگیرد سحر و افسونِ فرنگ

رُوح را بارِ گراں آئینِ غیر

گرچہ آید ز آسماں آئینِ غیر[1]

اقبالؒ نے عرض کی کہ اے بادشاہِ ذی جاہ! خدا کا شکر ہے کہ اب ہندوستان کے باشندے قانونِ فرنگ سے برگشتہ نظر آتے ہیں اور اب ان پر فرنگیوں کا سحر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا اور سچ تو یہ ہے کہ آئینِ غیر (Foreign Domination) اگرچہ منزل من السّماہی کیوں نہ ہو رُوح کے لئے بارِ گراں ہو گا۔

---

[1] اقبالؒ کے کوتاہ نظر مخالفین اس شعر کو غور سے پڑھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

سُلطان شہید :-

چوں بروید آدم از مشتِ گلے
با دمے ، باآرزوئے او دلے

لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست
غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست

زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست
تا خودی ناید بدست ، آید شکست

زائرِ شہر و دیارم بودۂ !
چشمِ خود را بر مزارم سودۂ !

اے شناسائے حدودِ کائنات
در دکن دیدی ز آثارِ حیات ؟

اے اقبال ! جب کسی انسان کے دِل میں آرزو پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ غلطی بھی کرتا ہے اور گناہ بھی ۔ اور وہ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے ۔ گناہوں کا ارتکاب کئے بغیر انسان کو اپنی خودی کا احساس نہیں ہو سکتا اور جب تک خودی پر اقتدار حاصل نہ ہو انسان زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

اے اقبال ! تو نے میرے مُلک (میسور) کی سیاحت بھی کی ہے اور خود میرے مزار کی زیارت بھی کی ہے اور تو شناسائے حدودِ کائنات بھی ہے ۔ مجھے بتا تو سہی ، دکن میں تجھے زندگی کے کچھ آثار

نظر آئے؟

زندہ رود (اقبال) :

غور سے پڑھئے۔ زندہ رود نے اس سوال کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ بلاغت کا تمام دفتر ان دو شعروں پر نثار کر دینے کو جی چاہتا ہے ؎

تخم اشکے ریختم اندر دکن
لالہ ہا روید ز خاکِ آں چمن

رود کاویری مدام اندر سفر
دیدہ ام در جانِ اُو شورِ دگر

اے سلطان ذی شان! آپ اطمینان رکھیں، آپ کی زبردست قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔ کائنات کا نظام اس قدر پیچیدہ ہے کہ سطحی نظر رکھنے والا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ گو آپ نے ۱۷۹۹ء میں اپنی بیش قیمت جان، آزادیٔ وطن پر نثار کی تھی اور اس واقعہ پر ۱۳۲ سال گزر جانے پر بھی کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ کبھی بھی نہ ہوگا۔ بعض علتوں کے نتائج صدیوں کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔

میں نے دکن کے باشندوں کو آپ کے زرّیں کارناموں سے آگاہ کر دیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس سرزمین سے ضرور ایسے سرفروش پیدا ہونگے، جو آپ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور مادرِ وطن کو اغیار کے قبضہ سے آزاد کرائیں گے۔

دریائے کاویری آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے جس طرح ۱۷۹۹ء میں بہتا تھا۔ (لَن تجِدَ لِسُنّۃِ اللہِ تَبدِیلاً) لیکن میں آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ سالِ گزشتہ (۱۹۳۰ء) جب میں وہاں گیا تو میں نے اس کی موجوں میں از سرِ نو طغیانی کے آثار دیکھے:

سُلطان شہیدؒ:

اے ترا دادند حرفِ دل فروز	از تپِ اشکت ہنوز
کاوِ کاوِ ناخنِ مردانِ راز	جُوئے خوں بکشاد از رگ ہائے ساز
آں نوا کز جانِ تو آید بروں	می دہد ہر سینہ را سوزِ دروں
بودہ ام در حضرتِ مولائے کُل	آنکہ بے او طے نمی گردد سُبل
گرچہ آنجا جرأتِ گفتار نیست	روح را کارے بجز دیدار نیست
سوختم از گرمی اشعارِ تو!	بر زبانم رفت از افکارِ تو
گفت ایں بیتے کہ برخواندی ز کیست؟	اندرو ہنگامہ ہائے زندگیست
با ہماں سوزے کہ در ساز و بجاں	یک دو حرف از ما بکاویری رساں

در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود

خوشتر آید سرود اندر سرود

(یعنی) اے اقبال! خدا تعالیٰ نے تجھے شعر و سخن کا دِل افروز اور دِل نواز ملکہ عطا کیا ہے۔ تیرے اشعار میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور تیرے کلام میں اس قدر سوز و گداز ہے کہ میں ابھی تک تڑپ رہا ہوں، درد دِل رکھنے

والے شاعر، بلاشبہ اپنی قوم کو بیدار کر سکتے ہیں۔ تیرا کلام مجھے یقین ہے سارے مسلمانوں کو زندہ کر دے گا اور پڑھنے والے کے دل میں قوم کا درد پیدا کر دے گا۔

اے اقبال! پچھلے دنوں مجھے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جس کی وساطت کے بغیر کوئی شخص روحانی منازل طے نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کے دربار میں کسی کو بولنے کی مجال نہیں اور روح کو دیدار کے علاوہ گفتار کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن میں تیرے کلام کے جوش و خروش سے بے خود ہو چکا تھا۔ اس لئے بے اختیار تیری روح پرور شاعری کا تذکرہ میرے لب پہ آگیا تو اللہ تعالیٰ نے جب تیرا کلام سنا تو مجھ سے پوچھا کہ "ٹیپو! یہ کس شاعر کا کلام ہے؟ اس میں تو زندگی کے آثار موجود ہیں!"
اے اقبال! چونکہ تیری زبان میں اثر ہے اس لئے جب تو ہندوستان واپس جائے تو دریائے کاویری کو میرا پیغام پہنچا دینا۔

پیغامِ سلطان شہیدؒ بہ رود کاویری:

(حقیقتِ حیات، مرگ و شہادت)

اس پیغام میں علامہ اقبالؒ نے سلطانِ شہیدؒ کی زبان سے زندگی کے تین اہم پہلو بے نقاب کئے ہیں۔ یعنی حیات، موت اور شہادت کا فلسفہ بیان کیا ہے:؎

رودِ کاویری یکے نرمک خرام | خستہ شاید کہ از سیرِ دوام

در کہستاں عمر ہا نالیدۂ راہِ خود را با مژہ کاویدۂ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات اے دکن را آب تو آبِ حیات
آہ شہرے کو در آغوشِ تو بود حُسنِ نوشیں جلوہ از نوشِ تو بود
کہنہ گردیدی، شبابِ تو ہماں پیچ و تاب و رنگ و آبِ تو ہماں
موجِ تو جز دانۂ گوہر نزاد طرّۂ تو تا ابد شوریدہ باد
اے ترا سازے کہ سوزِ زندگی است ہیچ می دانی کہ ایں پیغام کیست
آنکہ می کردی طوافِ سطوتش بودہ آئینہ دار دولتش
آنکہ صحرا ہا ز تدبیرش بہشت آنکہ نقشِ خود بخونِ خود نوشت
آنکہ خاکش مرجعِ صد آرزو ست اضطرابِ موجِ تو از خونِ او ست

آنکہ گفتارش ہمہ کردار بُود
مشرق اندر خواب اُو بیدار بُود

اے دریائے کاویری! ذرا ٹھہر جا۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لے۔ شاید تُو مسلسل چلتے رہنے سے کچھ تھک گیا ہو گا۔

اے پیارے دریا! تو مجھے جیحون (ترکستان) اور فرات (عراق) سے بھی زیادہ محبوب ہے اور اِس شہر کی محبت بھی میرے دِل میں بدستور موجود ہے جو تیری آغوش میں تھا[1]

---

[1] مُراد سرنگاپٹم اور خاص کر اُس کے تاریخی قلعے سے ہے جو دریائے کاویری کے عین وسط میں واقع تھا۔

اے کاویری! تو جانتا ہے یہ پیغام تجھے کون شخص بھیج رہا ہے؟ خوب سن لے
وہ شخص تجھے یہ پیغام بھیج رہا ہے جس کی سطوت کا تو نے مدتوں طواف کیا اور
جس کی بادشاہی کا تو مدتوں تک علمبردار رہا۔ جس نے اپنی لیاقت سے
صحراؤں کو گلزار بنا دیا تھا۔ جس نے اپنا نقش (روشنائی سے نہیں بلکہ)
اپنے خون سے تاریخِ عالم کے صفحات پر ثبت کیا، جس کی خاک آج بھی صدہا
آرزوؤں کا مرجع بنی ہوئی ہے جس کے خون کی بدولت آج بھی تیری
موجوں میں اضطراب پیدا ہے، جس کے نام سے آج بھی دشمنوں کا
رنگ فق ہو جاتا ہے اور دل سینوں میں لرز جاتے ہیں، جس کی شہادت
کی خوشی ۲۰ فروری ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں منائی گئی تھی اور اس میں سپاہی
سے لے کر گورنر جنرل تک سب شریک ہوئے تھے۔ ہاں وہی شخص جو
(بیسویں صدی کے مسلمان لیڈروں کی طرح) باتیں کرنا نہیں جانتا تھا
بلکہ سراپا عمل تھا، جو ۱۷۶۷ء سے لے کر جب کہ اس کی عمر ۱۶ سال
کی تھی ۱۷۹۹ء تک (تاریخِ شہادت) پورے ۳۲ سال تک شبانہ روز
شمشیر بکف رہا اور پوری طاقت کے ساتھ دشمنانِ وطن کا مقابلہ کرتا رہا۔
ہاں وہی شخص تجھے پیغام بھیج رہا ہے جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے
آخری دور میں جب کہ تمام مشرقی ممالک خوابِ خرگوش میں پڑے
ہوئے تھے...... جب کہ اس بدنصیب ملک کے باشندے مسلمانوں
سے انتقام لینے کی خاطر دشمنانِ وطن کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے.....
ہاں صرف وہی ایک شخص تھا جو بیدار تھا، جو دیکھ رہا تھا کہ وطنِ عزیز

پر اغیار کا قبضہ ہونے والا ہے جس نے اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو پکارا کہ آؤ، آپس کے اختلافات کو مٹا دو اور مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جاؤ۔ مگر نہ مرہٹوں نے اس کی پکار کا جواب دیا نہ مسلمانوں نے ......

بے ثباتیٔ عالمِ رنگ و بو

اے من و تو موجے از رودِ حیات
ہر نفس دیگر شود ایں کائنات

زندگانی انقلابِ ہر دمے است
زانکہ او اندر سراغ عالمے است

تار و پودِ ہر وجود از رفت و بود
ایں ہمہ ذوقِ نمود از رفت و بود

جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر
ہر کجا پنہاں سفر، پیدا حضر

کارواں و ناقہ و دشت و نخیل
ہر چہ بینی نالد از درد رحیل

در چمن گل میہمانِ یک نفس!
رنگ و آبش امتحانِ یک نفس!

موسمِ گل، ماتم و ہم نائے و نوش
غنچہ در آغوش و نعشِ گل بدوش

لالہ را گفتم یکے دیگر بسوز
گفت رازِ ما نمی دانی ہنوز

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود
غیر حسرت چیست پاداشِ نمود

افراد، اشیا اور مظاہرِ کائنات، یہ سب رودِ حیات کی موجیں ہیں اور یہ عالم ہر گھڑی منقلب ہوتا رہتا ہے۔ ہر موجود کی بنیاد فنا پر رکھی گئی ہے۔ ہر موجود فنا کی راہ پر گامزن ہے، آج ہے کل نہ ہوگا۔ انسان و حیوان، وحوش و طیور، باغ و راغ، جو کچھ نظر آتا ہے فانی ہے۔ باغ میں جو پھول آج شگفتہ ہے کل تک مرجھا جائے گا۔ دُنیا کی ہر دلفریب شے، ہر دلفریب منظر فانی ہے۔ ہر شے کا (خواہ وہ انسان ہو یا بے جان شے) حُسن چند روزہ ہے۔ اس عالم کی تعمیر کسی پائدار چیز سے نہیں ہوئی ہے

جائے دُنیا سرائے فانی ہے
یاں کی ہر چیز آنی جانی ہے

ہر موجود کو معدوم ہونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔ سکندر اور نپولین، تیمور اور چنگیز، محمود اور ملک شاہ سلجوقی سب اپنی اپنی چند روزہ نوبت بجا کر آغوشِ فنا میں سو گئے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۔

۱

حقیقتِ حیات:

در سرائے ہست و بود آئی؛ میا | از عدم سُوئے وجود آئی؛ میا
دریائی، چوں شرار از خود مرو | در تلاشِ خرمنے آوارہ شو
تلب و تب داری اگر مانندِ مہر | پابند در وسعت آبادِ سپہر

کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز ‏ ‏ ماہیاں را در تہِ دریا بسوز
سینۂ داری اگر در خورد تیر ‏ ‏ در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر
زآنکہ در عرضِ حیات آمد ثبات ‏ ‏ از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش

اے انسان! جب یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو گئی کہ یہ دُنیا سرائے فانی ہے، تو اب تیرے لئے دو صُورتیں ہیں۔ یا تو اس عالم میں آمت، اور اگر آتا ہے تو پھر شرارہ کی طرح اپنے وجُود کو بیکار ضائع مت کر بلکہ حصُولِ مقصد کے لئے کوشش کر۔ یعنی کسی خِرمن کی تلاش کر یعنی جب تجھ میں جلانے کی خاصیّت ہے تو پھر کسی کو جلا تاکہ تیری زِندگی کا مقصد حاصِل ہو سکے۔

اگر تجھ میں سورج کی طرح روشنی اور گرمی ہے تو کسی محل کے گوشہ میں آرام کرنے کے بجائے زِندگی کی کشمکش میں حِصّہ لے، خوبصُورت مٹی کی مُورتوں سے دِل مت لگا بلکہ میدانِ عمل میں نِکل کر اپنی مخفی صلاحیتوں کو ظاہر کر۔

اگر تیرے سینے میں دِل نہیں تو کِسی گوشے میں بیٹھ کر پریوں کا ناچ دیکھ لیکن اگر ہے تو پھر اس دُنیا میں شاہیں کی طرح فاتحانہ زندگی بسر کر اور شریفوں کی طرح جان دے!

یاد رکھو، اثبات اور دوام (زندگی جاوید) انسان کو صرف عرضِ

حیات (INTENSITY OF LIFE) سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی لئے مَیں نے خدا سے طولِ حیات (LONGENVITY OF LIFE) کی تمنّا نہیں کی۔ سُلطان کی شہادت ۴۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔)

اے انسان! مَیں تجھے بتاؤں کہ زندگی کا دین یا مسلک کیا ہے، یعنی زندگی کا معیار کیا ہے؟ سُن۔ زندگی کا معیار یہ ہے کہ:

"شیر کی حیاتِ یک روزہ گیدڑ کی حیاتِ صد سالہ سے بہتر ہے"

(ب)

حقیقتِ مرگ:-

زِندگی محکم ز تسلیم و رضاست
موت نیرنگ و طلسم و کیمیاست

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

می فتد بر مرگ، آں مردِ تمام
مثلِ شاہینے کہ اُفتد بر حمام

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ
زِندگی اُو را حرام از بیمِ مرگ

بندۂ آزاد را شانے دِگر
مرگِ اُو را می دہد جانے دِگر

اُو خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مرد آزاداں ز آنے بیش نیست

بگزر از مرگے کہ سازد با لحد
ز آنکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

اے انسان! اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ زندگی کو زرہ بکتر اور دولت
دشمت سے استحکام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنے
سے اور جو شخص یہ مسلک اختیار کر لیتا ہے تو پھر موت اس کی نظر میں
ایک نیرنگ یا طلسم سے بڑھ کر قیمت نہیں رکھتی، یعنی وہ موت سے
بے خوف ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو
جاتا ہے کہ:

"Death is also an aspect of life."

Iqbal.

جو شخص شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لیتا ہے، وہ بندۂ حق یا بندۂ مومن
بن جاتا ہے اور وہ موت سے مطلق نہیں ڈرتا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست
(اقبالؔ)

مومن اور کافر میں فرق:

کافر موت سے ڈرتا ہے، لیکن بندۂ حق یعنی مومن، موت سے نہیں ڈرتا
بلکہ موت خود اُس سے ڈرتی ہے۔ وہ شیر بن جاتا ہے اور موت کی حقیقت اُس
کی نظر میں وہی ہوتی ہے جو شیر کی نگاہ میں ہرن کی ہوتی ہے اور وہ موت
کو اپنی روحانی ترقی کی منازل میں سے ایک منزل سمجھتا ہے۔ وہ موت کو

اِس طرح شکار کرتا ہے جس طرح شاہین کبوتر کا۔

لیکن بندۂ طاغوت یعنی غلام ہر وقت موت سے ترساں اور لرزاں رہتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے زندگی اسکے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے ؎

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ زندگی اُو را حرام از بیم مرگ

یعنی وُہ ساری عمر زندگی کی لذت سے بے نصیب رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیوقوف لوگ اسے بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور اس کے سینے پر چند تمغے بھی آویزاں ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ مُردوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

برخلافِ ایں، بندۂ آزاد کی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ وُہ غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور سینے پر گولیاں کھا کر بظاہر مر جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے دُشمن اس کی نعش کی بے حُرمتی بھی کرتے ہیں اور جب رات کی تاریکی میں اس کی نعش ڈھونڈ کر نکالی جاتی ہے تو وُہ بالکل برہنہ ہوتی ہے .... وُہ تخت و تاج، دولت و حشمت، حکومت و اقتدار اور زندگی سب سے محرُوم ہو جاتا ہے لیکن اُس کی موت .... سپاہیانہ موت .... اُسے نئی زِندگی عطا کر دیتی ہے .... زیادہ شان دار .... زیادہ پائدار۔ اس کے دُشمنوں پر، اُس کی نعش دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ وُہ اسے زِندہ تصوّر کرتے ہیں؛ اُس کے دِل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہیں کہ واقعی مر گیا ....! اُنہیں یقین نہیں آتا کہ وُہ مر گیا .... کیوں؟ اس لئے کہ اُس کے چہرہ پر کامیابی کی

جھلک ہوتی ہے .... اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نظر آتی ہے ..... اُس کی نیم وا آنکھوں سے جلال ٹپکتا ہے .... اُس کے چہرے پر نُور برستا ہے .... کیوں؟ ... اِس لئے کہ وُہ مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے ..... اُسے بقائے دوام حاصِل ہو جاتی ہے .... اس کا دِل زِندہ ہو جاتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بندۂ آزاد کے ذہن میں موت کا تصوّر نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا تصوّر ہوتا ہے۔ وُہ اپنی خودی کی نگہبانی کرتا ہے۔ وُہ خُود اندیش ہوتا ہے، مرگ اندیش نہیں ہوتا۔ مرگ کا اندیشہ کرنا غلاموں کا شیوہ ہے نہ کہ آزادوں کا۔ یہی وجہ ہے کہ بندۂ آزاد صِرف ایک لمحے کے لئے مرتا ہے۔ اس پر صِرف ایک لمحے کے لئے موت وارد ہوتی ہے، وُہ مرتے ہی فوراً زندہ ہو جاتا ہے اور پھر ہمیشہ زندہ رہتا ہے .... یقین نہ ہو تو سرنگا پٹم جا کر دیکھ لو۔ اس کے کھنڈر آج بھی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ سُلطان شہید رح زندہ ہے .... اس کے مزار پر جا کر دیکھ لو۔ آج بھی اس کی لوحِ تُربت سے وُہی سطوت آشکارا ہے جو ۱۷۹۹ء میں تھی۔ میجر ایلن۔ جنرل بیرڈ۔ جنرل ہیرس اور لارڈ ویلزلی سب مر گئے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے ...... آج کوئی شخص ان کو یاد نہیں کرتا .... لیکن

ٹیپو سُلطان آج بھی زندہ ہے۔ اس کے نام میں آج بھی وُہ تاثیر ہے کہ جب زبان پر آتا ہے تو خون رگوں میں تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے ..... وُہ بھی زندہ ہے۔ اُس کا نام بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا...... میجر ایلن اور جنرل بیرڈ اور جنرل ہیرس کا نام صِرف تاریخوں میں لکھا ہوا ہے لیکن سُلطان کا نام ہر حُریّت پسند انسان کے دِل پر ثبت ہے اور قیامت تک ثبت رہے گا........

پس اے انسان! اے عزّت و جاہِ ارضی کے متوالے! اے مہمل خطابات کے شیدائی! اے زر۔ زن۔ زمین کے تمنّائی! اس موت سے دُور بھاگ جو تجھے ہمیشہ کے لئے لحد کی گمنامی میں سلا دے .... جو تجھے فنا کر دے' کیوں؟ اِس لئے کہ یہ موت انسان کے شایانِ شان نہیں۔ یہ تو دام و دد یعنی کُتّوں اور بلّیوں کے لئے موزُوں ہے اور تو انسان ہے۔

ج

فلسفہ شہادت:۔

مردِ مؤمن خواہد از یزدانِ پاک ۔۔۔ آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک

آں دگر مرگ! انتہائے راہِ شوق ۔۔۔ آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

گرچہ ہر مرگ است بر مؤمن شکر ۔۔۔ مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست — ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

کس نداند جُز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

مردِ مومن ، دام و دَد کی موت سے سخت نفرت کرتا ہے ، وُہ خُدا سے ایسی موت کی تمنّا کرتا ہے جو اُسے عالمِ مادی سے بلند کر دے اور مکان و زمان کی قید سے آزاد کر دے ۔ یہ کون سی موت ہے ؟ یہ وُہ موت ہے جو عاشقوں کو آتی ہے ۔ یہ موت راہِ شوق کی انتہا ہے اور عشق کے میدانِ جنگ میں عاشق کی آخری تکبیر ہے ۔

اگرچہ مومن کے لئے ہر موت شیریں ہے ، یعنی وُہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جس رنگ میں بھی آئے ، اسے لبّیک کہتا ہے لیکن وُہ موت سب سے زیادہ مکرّم اور محترم اور لائقِ عزّت ہے جو حضرت علی رض کے بیٹے سیّد الشہداء امام العاشقین ، رئیس الاحرار امیر المومنین حضرت حسین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام الی یوم القیام کے حصّے میں آئی ۔

شاہانِ عالم کی جنگ کیا ہے ؟ محض غارت گری اور نفس پروری لیکن مومن کی جنگ کیا ہے ؟ سُنّتِ رسُول اللہ صلّے اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم ، یعنی باطل کا مقابلہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے نام (اس کے مذہب اور اُس کے

قانون) کو دُنیا میں بلند کرنا، اپنی آزادی اور عزّت کو برقرار رکھنا، اسلام اور قرآن کی آزادی کو دُنیا میں قائم کرنا اور برقرار رکھنا۔ چنانچہ آنحضرت صلّے اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جب کبھی تلوار اُٹھائی تو اِسلام کی حمایت میں محض اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے لئے اور اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

مؤمن کی جنگ کیا ہے؟ اپنے محبوب (خُدا) کی طرف ہجرت کرنا۔ اِس دُنیا اور اِس کی دِلچسپیوں سے مُنہ موڑ کر اپنے محبوب کے کُوچہ کی طرف رواں ہونا۔ چنانچہ اسی لئے سرکارِ دوعالم صلّے اللہ علیہ وسلّم نے، جنھوں نے دُنیا کی اقوام کو اللہ تعالےٰ سے محبّت کرنے کی تعلیم دی۔ فرمایا: "الجہادُ رُھبانِیَّۃُ الاِسلامِ" یعنی دیگر مذاہب تو خدا ہی کیلئے ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتے ہیں اور اس کا نام اصطلاح میں رہبانیت ہے لیکن اسلام اس مقصد کے حصُول کا طریقہ جہاد فی سبیل اللہ کو قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلام کی رہبانیت جہاد ہے اور شہید کے علاوہ اور کوئی شخص اس نکتہ کو Appreciate نہیں کر سکتا، کیونکہ وُہ تو اپنی جان دے کر اس نکتہ کو خریدتا ہے۔ پس اس سے بڑھ کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اور کون کر سکتا ہے؟

خاتمۃ الکلام

مندرجہ بالا سطور میں اگرچہ سُلطان شہید رح کا پیغام بہت مختصر طور پر ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے لیکن اِس کی رُوح پُورے طور پر واضح کر دی

گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان نوجوان اس رُوح کو اپنے دِل کی گہرائی میں اُتارنے کی کوشش کریں گے تاکہ اُن کی زندگی کا مقصد حاصِل ہو سکے! ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی

(اقبالؔ)

بیادِ سلطان ٹیپو شہید نور اللہ مرقدہٗ

میاں مشتاق احمد بھٹی ایم۔اے

نوجوانِ مسلم! ذرا تاریخ کے اوراق دیکھ
گُل کھلاتی ہے عجب کیا گردشِ آفاق دیکھ
دیکھ کیوں نذرِ خزاں تیرا گلستاں ہو گیا
کس طرح شیرازۂ مِلّت پریشاں ہو گیا
کس طرح اے قیس بے لیلےٰ ہُوا محمل تِرا
پھونک ڈالا بجلیوں نے کِس طرح حاصِل تِرا
شورشِ دریا سے کیوں موجیں گریزاں ہو گئیں
ناشناسائے جنونِ فتنہ ساماں ہو گئیں
مَیں نہیں کہتا کہ تُو راحت نوازِ گوش رہ
مَیں نہیں کہتا کہ تُو مستِ سرودِ دوش رہ

مَیں نہیں کہتا کہ سُن کر معرکے اجداد کے
خوابِ رنگیں دیکھ اُس دَورِ نشاط آباد کے
"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قِصّۂ پارینہ را"
آہ! اب شمشیر کے جلووں سے تُو رُو پوش ہے
نعرۂ اللہ اکبر کی صدا خاموش ہے
ہچکچاہٹ ہے تجھے اب دعوتِ پیکار میں
لُطف لے سکتا نہیں تلوار کی جھنکار میں
یادِ ایامِ سَلف کچھ دِل کو گرماتی نہیں
اب نگاہِ شوق بیرُونِ قفس جاتی نہیں
رُوحِ ٹیپُو کر رہی ہے اُس جوان کا انتظار
عظمتِ اسلام جو کر دے جہاں پر آشکار
مُدتوں سے لگ رہی ہے اس زمیں پر ٹکٹکی
ڈھونڈتی ہے اِس سیہ خانہ میں شمعِ زندگی

ہے ارجز یا نغمہ؟ کیا ہے جو درونِ ساز ہے
آہ! وہ مردِ مجاہد گوشش بر آواز ہے
اب تلک تازہ ہیں اُسکے زخمہائے خوں چکاں
کہہ رہے ہیں کوششِ ناکام کی اِک داستاں
آرزوئے زندگی ہے حفظِ فطرت کے لئے
ہے تمنّائے زیست کی ذوقِ شہادت کے لئے
وُہ شہیدِ حُرّیت ہم فطرتِ سیماب ہے
کشورِ ہندوستاں کے واسطے بیتاب ہے
اب بھی گر اِس کارواں کی راہ سے اُٹھے غبار
میرا ایمان ہے کہ آجائے وُہ مردِ شاہسوار
ہے کوئی جو پھونک دے مِلّت میں پھر روحِ حیات؟
اور اُسے اِس اضطرابِ مستقل سے دے نجات؟

ٹیپو اور انسدادِ غلامی

سُلطان کے تخت نشین ہونے سے پہلے جنوُبی ہند اور میسُور میں غلامی کا عام رواج تھا۔ سُلطان نے غلامی کے اِنسداد کے لئے ایک فرمان جاری کیا جس کی نقل ذیل میں درج ہے:

ٹیپو سُلطان

بِسمِ اللّٰہ الرّحمٰنِ الرّحِیم

"در شہر گنجام برادران و خویشان مردم نوکر پیشہ وغیرہ کہ بروزگار ہستند آنہا را گرفتہ در پیادہائے علاقہ ایشاں نوشتہ نوملازم کنایند و غلاماں را سرکارِ خداداد یک قلم آزاد فرمودہ شُدہ است ما ایشاں نیز تقیّد و خبرگیری ایں معنی داشتہ از آنہا غلاماں را آزاد کنانند۔ غلاماں برضا و رغبتِ خود پیش ہر کس کہ بطورِ نوکراں نوکری نمایند مختار اند۔ نوزدہم ماہ دے سال حراست ۱۲۱۴ء مولُودِ محمّدؐ"

بنی مالکؒ

اے کاویری! تو جانتا ہے یہ پیغام تجھے کون شخص بھیج رہا ہے؟ خوب سن لے وہ شخص تجھے یہ پیغام بھیج رہا ہے جس کی سطوت کا تو نے مدتوں طواف کیا اور جس کی بادشاہی کا تو مدتوں تک علمبردار رہا۔ جس نے اپنی لیاقت سے صحراؤں کو گلزار بنا دیا تھا۔ جس نے اپنا نقش (روشنائی سے نہیں بلکہ) اپنے خون سے تاریخ عالم کے صفحات پر ثبت کیا، جس کی خاک آج بھی صدہا آرزوؤں کا مرجع بنی ہوئی ہے، جس کے خون کی بدولت آج بھی تیری موجوں میں اضطراب پیدا ہے، جس کے نام سے آج بھی دشمنوں کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور دل سینوں میں لرز جاتے ہیں، جس کی شہادت کی خوشی ۲۱ فروری ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں منائی گئی تھی اور اس میں سپاہی سے لے کر گورنر جنرل تک سب شریک ہوئے تھے۔ ہاں وہی شخص جو (بیسویں صدی کے مسلمان لیڈروں کی طرح) باتیں کرنا نہیں جانتا تھا بلکہ سراپا عمل تھا، جو ۱۷۶۷ء سے لے کر جب کہ اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی ۱۷۹۹ء تک (تاریخِ شہادت) پورے ۳۲ سال تک شبانہ روز شمشیر بکف رہا اور پوری طاقت کے ساتھ دشمنانِ وطن کا مقابلہ کرتا رہا۔ ہاں وہی شخص تجھے پیغام بھیج رہا ہے جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری دور میں جب کہ تمام مشرقی ممالک خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے تھے ..... جب کہ اس بدنصیب ملک کے باشندے مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر دشمنانِ وطن کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے .....

ہاں صرف وہی ایک شخص تھا جو بیدار تھا، جو دیکھ رہا تھا کہ وطنِ عزیز

پر اغیار کا قبضہ ہونے والا ہے جس نے اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو پکارا کہ آؤ، آپس کے اختلافات کو مٹا دو اور مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جاؤ۔ مگر نہ مرہٹوں نے اس کی پکار کا جواب دیا نہ مسلمانوں نے ......

بے ثباتیٔ عالمِ رنگ و بو

اے من و تو موجے از رودِ حیات
ہر نفس دیگر شود ایں کائنات

زندگانی انقلابِ ہر دمے است
زانکہ او اندر سراغِ عالمے است

تار و پودِ ہر وجود از رفت و بود
ایں ہمہ ذوقِ نمود از رفت و بود

جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر
ہر کجا پنہاں سفر، پیدا حضر

کارواں و ناقہ و دشت و نخیل
ہر چہ بینی نالد از دردِ رحیل

در چمن گل میہمانِ یک نفس!
رنگ و آبش امتحانِ یک نفس!

موسمِ گل، ماتم و ہم نائے و نوش
غنچہ در آغوش و نعشِ گل بدوش

لالہ را گفتم یکے دیگر بسوز
گفت رازِ ما نمی دانم ہنوز

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود
غیر حسرت چیست پاداشِ نمود

افراد، اشیا اور مظاہر کائنات، یہ سب رودِ حیات کی موجیں ہیں اور یہ عالم ہر گھڑی منقلب ہوتا رہتا ہے۔ ہر موجود کی بنیاد فنا پر رکھی گئی ہے۔ ہر موجود فنا کی راہ پر گامزن ہے، آج ہے کل نہ ہوگا۔ انسان و حیوان، وحوش و طیور، باغ و راغ، جو کچھ نظر آتا ہے فانی ہے۔ باغ میں جو پھول آج شگفتہ ہے، کل تک مرجھا جائے گا۔ دنیا کی ہر دلفریب شئے، ہر دلفریب منظر فانی ہے۔ ہر شئے کا (خواہ وہ انسان ہو یا بے جان شئے) حسن چند روزہ ہے۔ اس عالم کی تعمیر کسی پائدار چیز سے نہیں ہوئی ؎

جائے دنیا سرائے فانی ہے
یاں کی ہر چیز آنی جانی ہے

ہر موجود کو معدوم ہونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔ سکندر اور نپولین، تیمور اور چنگیز، محمود اور ملک شاہ سلجوقی سب اپنی اپنی چند روزہ نوبت بجا کر آغوشِ فنا میں سو گئے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔

۱

حقیقتِ حیات :۔

در سرائے ہست و بود آئی ؟ میا	از عدم سوئے وجود آئی ؟ میا
در بیابانے چوں شرار از خود مرد	در تلاشِ خرمنے آوارہ شو
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر	پا بند در وسعت آباد سپہر

کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز | ماہیاں را در تہِ دریا بسوز
سینۂ داری اگر در خورد تیر | در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر
زآنکہ در عرضِ حیات آمد ثبات | از خدا کم خواستم طولِ حیات

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش

اے انسان! جب یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو گئی کہ یہ دُنیا سرائے فانی ہے، تو اب تیرے لئے دو صورتیں ہیں۔ یا تو اس عالم میں آمد' اور اگر آتا ہے تو پھر شرارہ کی طرح اپنے وجود کو بیکار ضائع مت کر بلکہ حصولِ مقصد کے لئے کوشش کر۔ یعنی کسی خرمن کی تلاش کر یعنی جب تجھ میں جلانے کی خاصیت ہے تو پھر کسی کو جلا تاکہ تیری زندگی کا مقصد حاصل ہو سکے۔

اگر تجھ میں سورج کی طرح روشنی اور گرمی ہے تو کسی محل کے گوشہ میں آرام کرنے کے بجائے زندگی کی کشمکش میں حصہ لے، خوبصورت مٹی کی مورتوں سے دِل مت لگا بلکہ میدانِ عمل میں نکل کر اپنی مخفی صلاحیتوں کو ظاہر کر۔

اگر تیرے سینے میں دِل نہیں تو کسی گوشے میں بیٹھ کر پریوں کا ناچ دیکھ لیکن اگر ہے تو پھر اس دُنیا میں شاہیں کی طرح فاتحانہ زندگی بسر کر اور شریفوں کی طرح جان دے!

یاد رکھ، اثبات اور دوام (زندگی جاوید) انسان کو صرف عرضِ

حیات (INTENSITY OF LIFE) سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی لئے میں نے خدا سے طولِ حیات (LONGENVITY OF LIFE) کی تمنّا نہیں کی۔ سلطان کی شہادت ۴۸ سال کی عمر میں ہوتی تھی۔)

اے انسان! میں تجھے بتاؤں کہ زندگی کا دین یا مسلک کیا ہے، یعنی زندگی کا معیار کیا ہے؟ سُن۔ زندگی کا معیار یہ ہے کہ:

"شیر کی حیاتِ یک روزہ گیدڑ کی حیاتِ صد سالہ سے بہتر ہے"۔

(ب)

حقیقتِ مرگ: ؎

زِندگی محکم ز تسلیم و رضاست
موت نیرنگ و طلسم و کیمیاست

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

می فتد بر مرگ، آں مردِ تمام
مثلِ شاہینے کہ اُفتد بر حمام

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ
زِندگی اُو را حرام از بیمِ مرگ

بندۂ آزاد را شانے دِگر
مرگِ اُو را می دہد جانے دِگر

اُو خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مردِ آزاداں ز آنے بیش نیست

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد
ز انکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

اے انسان! اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ زندگی کو زرہ بکتر اور دولت وحشمت سے استحکام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنے سے اور جو شخص یہ مسلک اختیار کر لیتا ہے تو پھر موت اس کی نظر میں ایک نیرنگ یا طلسم سے بڑھ کر قیمت نہیں رکھتی، یعنی وہ موت سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ:

"Death is also an aspect of life."*

Iqbal.

جو شخص شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لیتا ہے، وہ بندۂ حق یا بندۂ مومن بن جاتا ہے اور وہ موت سے مطلق نہیں ڈرتا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست (اقبال)

مومن اور کافر میں فرق:

کافر موت سے ڈرتا ہے، لیکن بندۂ حق یعنی مومن، موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت خود اُس سے ڈرتی ہے۔ وہ شیر بن جاتا ہے اور موت کی حقیقت اُس کی نظر میں وہی ہوتی ہے جو شیر کی نگاہ میں ہرن کی ہوتی ہے اور وہ موت کو اپنی روحانی ترقی کی منازل میں سے ایک منزل سمجھتا ہے۔ وہ موت کو

اِس طرح شکار کرتا ہے جس طرح شاہین کبوتر کا۔

لیکن بندۂ طاغوت یعنی غلام ہر وقت موت سے ترساں اور لرزاں رہتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے زندگی اسکے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے ؎

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ ‏ ‏ ‏ ‏ زندگی اُو را حرام از بیم مرگ

یعنی وہ ساری عمر زندگی کی لذت سے بے نصیب رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیوقوف لوگ اسے بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور اس کے سینے پر چند تمغے بھی آویزاں ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ مُردوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

برخلافِ ایں، بندۂ آزاد کی شان کچھ اَور ہی ہوتی ہے۔ وُہ غلامی کی زِندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اَور سینے پر گولیاں کھا کر بظاہر مر جاتا ہے اَور بعض اوقات اس کے دُشمن اس کی نعش کی بے حُرمتی بھی کرتے ہیں اور جب رات کی تاریکی میں اس کی نعش ڈھونڈ کر نکالی جاتی ہے تو وُہ بالکل برہنہ ہوتی ہے .... وُہ تخت و تاج، دولت و حشمت، حکومت و اقتدار اور زندگی سب سے محرُوم ہو جاتا ہے لیکن اُس کی موت .... سپاہیانہ موت .... اُسے نئی زِندگی عطا کر دیتی ہے .... زیادہ شان دار .... زیادہ پائدار۔ اس کے دُشمنوں پر، اُس کی نعش دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ وُہ اسے زِندہ تصوّر کرتے ہیں، اُس کے دِل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہیں کہ واقعی مر گیا ....! اُنہیں یقین نہیں آتا کہ وُہ مر گیا .... کیوں؟ اس لئے کہ اُس کے چہرہ پر کامیابی کی

جھلک ہوتی ہے .... اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نظر آتی ہے ..... اُس کی نیم وا آنکھوں سے جلال ٹپکتا ہے .... اُس کے چہرے پر نُور برستا ہے .... کیوں؟ ... اِس لئے کہ وُہ مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے ..... اُسے بقائے دوام حاصِل ہو جاتی ہے .... اس کا دِل زِندہ ہو جاتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بندۂ آزاد کے ذہن میں موت کا تصوّر نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا تصوّر ہوتا ہے۔ وُہ اپنی خودی کی نگہبانی کرتا ہے۔ وُہ خود اندیش ہوتا ہے، مرگ اندیش نہیں ہوتا۔ مرگ کا اندیشہ کرنا غلاموں کا شیوہ ہے نہ کہ آزادوں کا۔ یہی وجہ ہے کہ بندۂ آزاد صِرف ایک لمحے کے لئے مرتا ہے۔ اس پر صِرف ایک لمحے کے لئے موت وارد ہوتی ہے، وُہ مرتے ہی فوراً زندہ ہو جاتا ہے اور پھر ہمیشہ زندہ رہتا ہے .... یقین نہ ہو تو سرنگا پٹم جا کر دیکھ لو۔ اس کے کھنڈر آج بھی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ سُلطان شہید رح زندہ ہے ....

اس کے مزار پر جا کر دیکھ لو۔ آج بھی اس کی لوحِ تُربت سے وُہی سطوت آشکارا ہے جو ۱۷۹۹ء میں تھی۔ میجر ایلن۔ جنرل بیرڈ۔ جنرل ہیرس اور لارڈ ویلزلی سب مر گئے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے .... آج کوئی شخص ان کو یاد نہیں کرتا .... لیکن

ٹیپو سلطان آج بھی زندہ ہے۔ اس کے نام میں آج بھی وہ تاثیر ہے کہ جب زبان پر آتا ہے تو خون رگوں میں تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے ..... وہ بھی زندہ ہے۔ اس کا نام بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا...... میجر ایلن اور جنرل بیرڈ اور جنرل ہیرس کا نام صرف تاریخوں میں لکھا ہوا ہے لیکن سلطان کا نام ہر حریت پسند انسان کے دل پر ثبت ہے اور قیامت تک ثبت رہے گا ....

پس اے انسان! اے عزت و جاہِ ارضی کے متوالے! اے مہمل خطابات کے شیدائی! اے زر۔ زن۔ زمین کے تمنائی! اس موت سے دُور بھاگ جو تجھے ہمیشہ کے لئے لحد کی گمنامی میں سلادے .... جو تجھے فنا کردے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ موت انسان کے شایانِ شان نہیں۔ یہ تو دام و دد یعنی کتوں اور بلیوں کے لئے موزوں ہے اور تو انسان ہے۔

ج

فلسفہ شہادت:۔

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک
آں دگر مرگے کہ برگیرد زخاک

آں دگر مرگ! انتہائے راہِ شوق
آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰ رضؓ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است　　جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست　　ترکِ عالم اختیار کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت　　جنگ را رہبانیِ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

مردِ مومن، دام و دَد کی موت سے سخت نفرت کرتا ہے، وُہ خُدا سے ایسی موت کی تمنّا کرتا ہے جو اُسے عالمِ مادی سے بلند کر دے اَور مکان و زمان کی قید سے آزاد کر دے۔ یہ کون سی موت ہے؟ یہ وُہ موت ہے جو عاشقوں کو آتی ہے۔ یہ موت راہِ شوق کی انتہا ہے اَور عشق کے میدانِ جنگ میں عاشق کی آخری تکبیر ہے۔

اگرچہ مومن کے لئے ہر موت شیریں ہے، یعنی وُہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اَور جس رنگ میں بھی آئے، اسے لبیک کہتا ہے لیکن وُہ موت سب سے زیادہ مکرّم اَور محترم اور لائقِ عزّت ہے جو حضرت علی رضؓ کے بیٹے سیّد الشہدا، امام العاشقین، رئیس الاحرار امیر المؤمنین حضرت حسین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام الیٰ یوم القیام کے حصّے میں آئی۔

شاہانِ عالم کی جنگ کیا ہے؟ محض غارت گری اَور نفس پروری لیکن مومن کی جنگ کیا ہے؟ سُنّتِ رسُول اللہ صلّے اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم، یعنی باطل کا مقابلہ کرنا اَور اللہ تعالیٰ کے نام (اس کے مذہب اَور اُس کے

قانون) کو دُنیا میں بلند کرنا، اپنی آزادی اور عزّت کو برقرار رکھنا، اسلام اور قرآن کی آزادی کو دُنیا میں قایم کرنا اور برقرار رکھنا۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جب کبھی تلوار اُٹھائی تو اِسلام کی حمایت میں محض اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے لئے اور اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

مؤمن کی جنگ کیا ہے؟ اپنے محبُوب (خدا) کی طرف ہجرت کرنا۔ اِس دُنیا اور اِس کی دِلچسپیوں سے مُنہ موڑ کر اپنے محبُوب کے کُوچہ کی طرف رواں ہونا۔ چنانچہ اسی لئے سرکارِ دوعالم صلّے اللہ علیہ وسلّم نے، جنھوں نے دُنیا کی اقوام کو اللہ تعالےٰ سے محبّت کرنے کی تعلیم دی۔ فرمایا: "اَلجِھَادُ رُھبَانِیَّۃُ الاِسلَامِ" یعنی دیگر مذاہب تو خدا کی کیلئے ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتے ہیں اور اس کا نام اصطلاح میں رہبانیت ہے لیکن اسلام اس مقصد کے حصُول کا طریقہ جہاد فی سبیل اللہ کو قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلام کی رہبانیت جہاد ہے اور شہید کے علاوہ اور کوئی شخص اس نکتہ کو Appreciate نہیں کر سکتا، کیونکہ وُہ تو اپنی جان دے کر اس نکتہ کو خریدتا ہے۔ پس اس سے بڑھ کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اور کون کر سکتا ہے:

خاتمۃ الکلام

مندرجہ بالا سطوُر میں اگرچہ سُلطان شہید رح کا پیغام بہت مختصر طور پر ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے لیکن اِس کی رُوح پوُرے طور پر واضح کر دی

گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان نوجوان اس روح کو اپنے دِل کی گہرائی میں اُتارنے کی کوشش کریں گے تاکہ اُن کی زندگی کا مقصد حاصِل ہو سکے! ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی

(اقبالؔ)

بیادِ سلطان ٹیپو شہید نوّر اللہ مرقدہ

میاں مشتاق احمد بھٹی ایم۔اے

نوجوانِ مسلم! ذرا تاریخ کے اوراق دیکھ
گل کھلاتی ہے عجب کیا گردشِ آفاق دیکھ
دیکھ کیوں نذرِ خزاں تیرا گلستاں ہو گیا
کس طرح شیرازۂ ملّت پریشاں ہو گیا
کس طرح اے قیس بے لیلےٰ ہوا محمل ترا
پھونک ڈالا بجلیوں نے کس طرح حاصل ترا
شورشِ دریا سے کیوں موجیں گریزاں ہو گئیں
ناشناسائے جنونِ فتنہ ساماں ہو گئیں
میں نہیں کہتا کہ تو راحت نوازِ گوش رہ
میں نہیں کہتا کہ تو مستِ سرودِ دوش رہ

مَیں نہیں کہتا کہ سُن کر معر کے اجداد کے
خوابِ رنگیں دیکھ اُس دورِ نشاط آباد کے
"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قِصّۂ پارینہ را"
آہ! اب شمشیر کے جلووں سے تو رُوپوش ہے
نعرۂ اللہ اکبر کی صدا خاموش ہے
ہچکچاہٹ ہے تجھے اب دعوتِ پیکار میں
لُطف لے سکتا نہیں تلوار کی جھنکار میں
یادِ ایامِ سَلف کچھ دِل کو گرماتی نہیں
اب نگاہِ شوق بیرونِ قفس جاتی نہیں
رُوحِ ٹیپو کر رہی ہے اُس جوان کا انتظار
عظمتِ اسلام جو کر دے جہاں پہ آشکار
مُدتوں سے تک رہی ہے اس زمیں پر ٹکٹکی
ڈھونڈتی ہے اِس سیہ خانہ میں شمع زندگی

ہے رجز یا نغمہ؟ کیا ہے جو درونِ ساز ہے
آہ! وہ مردِ مجاہد گوشش بر آواز ہے
اب تلک تازہ ہیں اُسکے زخمہائے خونچکاں
کہہ رہے ہیں کوششِ ناکام کی اِک داستاں
آرزوئے زندگی ہے حفظِ فطرت کے لئے
ہے تمنّائے زیست کی ذوقِ شہادت کے لئے
وُہ شہیدِ حُرّیت ہم فطرتِ سیماب ہے
کشورِ ہندوستاں کے واسطے بیتاب ہے
اب بھی گر اس کاروان کی راہ سے اُٹھے غُبار
میرا ایمان ہے کہ آجائے وُہ مردِ شاہسوار
ہے کوئی جو پھونک دے ملّت میں پھر روحِ حیات؟
اور اُسے اِس اضطرابِ مستقل سے دے نجات؟

ٹیپو اور انسدادِ غلامی

سُلطان کے تخت نشین ہونے سے پہلے جنُوبی ہند اور میسور میں غلامی کا عام رواج تھا۔ سُلطان نے غلامی کے اِنسداد کے لئے ایک فرمان جاری کیا جس کی نقل ذیل میں درج ہے:

ٹیپو سُلطان

بِسمِ اللّٰہ الرّحمٰنِ الرّحیم

"در شہر گنجام برادران و خویشان مردم نوکر پیشہ وغیرہ کہ بروزگار ہستند آنہا را گرفتہ در پیادہائے علاقہ ایشاں نوشتہ نو ملازم کنایند و غلاماں را سرکارِ خداداد بیک قلم آزاد فرمودہ شُدہ است۔ ایشاں نیز تقیدّ و خبرگیری ایں معنی داشتہ از آنہا غلاماں را آزاد کنانند۔ غلاماں برضا و رغبتِ خود پیش ہر کس کہ بطورِ نوکراں نوکری نمایند مختار اند۔ نوزدہم ماہ دے سال حاست ۱۲۱۶ھ مولودِ محمدؐ"

بنی مالکؒ